دنیا اور مغرب
www.KitaboSunnat.com
پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی
مترجم: ڈاکٹر حسین احمد پراچہ
نشریات

www.KitaboSunnat.com

دنیا اور مغرب

دنیا اور مغرب

تہذیبی تصادم کا تاریخی جائزہ

مؤلف

پروفیسر آرنلڈ جے، ٹائن بی

مترجم

ڈاکٹر حسین احمد پراچہ

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

نظر ثانی

پروفیسر عبدالحمید صدیقی

نشریات

۴۰ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۴۵۸۹۴۱۹۔۰۳۲۱

۹۰۹،۰۹ ٹائن بی، جے، آرنلڈ، پروفیسر، ترجمہ: ڈاکٹر حسین احمد پراچہ
ء۔ا۔د دنیا اور مغرب (تہذیبی تصادم کا تاریخی جائزہ)
لاہور: نشریات
۲۰۰۶ء ص: ۹۵
تاریخ، تہذیب، فلسفہ تاریخ
ISBN 969-8983-08-2

کتاب : دنیا اور مغرب
مترجم : ڈاکٹر حسین احمد پراچہ
اہتمام : نشریات، لاہور
مطبع : میٹرو پریس، لاہور
قیمت : ۶۰ روپے

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

علوم وفنون کی کہکشاں میں ایک ستارہ اپنی ضیا پاشیوں، جلوہ سامانیوں اور ضوفشانیوں کے ساتھ طلوع ہوا۔ اس کی روشنی میں افراد اور اقوام کے کارنامے، حکمرانوں اور فاتحین کی رزم آرائیاں، مفکرین اور علما کی علمی فتوحات، تہذیبوں اور تمدنوں کا تصادم اور ان کے عروج وزوال کی داستان، مذاہب وادیان کا دبستان اور ادب وثقافت کی جمالیات' سبھی کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اسی مربوط مطالعے اور منضبط مشاہدے کو''تاریخ'' کا نام دیا گیا۔ آئینۂ تاریخ میں جہاں عام دلچسپی کے وقائع دکھائی دیتے ہیں وہاں انسانی زندگی کی سماجی، معاشرتی، تمدنی، ثقافتی اور علمی اقدار وروایات کی تفصیلات بھی جلوہ گر ہیں۔ اقوام اور قبائل کی باہمی کشمکش اور آویزش، سلطنتوں کی باہمی رقابت اور مخاصمت' مفادات اور استحصال کی جنگ، گزشتہ وقائع کی یادداشتیں، اقوامِ ماضیہ کے تذکرے، روئے ارضی کی دل فریبیاں اور دلچسپیاں، دربارِ شاہی کے وقائع نگاروں کی رودادیں، ماہرین فن کے عجائب اور کارنامے، آثار قدیمہ کی تفصیلات، عظیم شخصیات کی سوانح، رزم وبزم کی حکایات، فکر ودانش کی جھلکیاں اور محلات وقصور، شاہی درباروں اور سلطنتوں کے دارالخلافوں میں جنم لینے والی سازشیں، فتنے اور فسانے نیز مختلف اداروں، تنظیموں اور تحریکات کا آغاز وارتقا سبھی تاریخ کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ مؤرخ کا قلم جب ان وقائع کے تجزیے پر آمادہ ہوتا ہے تو یہاں اس کا اصل جوہر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ یا تو واقعات کو تاریخی طور پر ایک استناد (Historicity) بخشتا ہے یا پھر تحقیقی میزان میں ان واقعات کے محض افسانہ وافسوں ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ تاریخ کے طومار میں حقیقی وقائع کی مقدار اور تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے۔ یوں تاریخ نگاری (Historiography) ایک ایسا فن ہے جس کے

تقاضوں پر مشرق و مغرب میں بہت کم وقائع نگار اور مؤرخین پورے اترتے ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی بنیادی کتب میں تاریخ کا لوازمہ فراوانی سے ملتا ہے مگر مسلمانوں کو عطا ہونے والا مقدس صحیفہ جسے قرآن مجید کہتے ہیں، فن تاریخ کا بھی ایک نادر شہ پارہ ہے۔ اس میں انسانی زندگی اور تہذیب کے آغاز و ارتقاء، انبیاء و رسل کی دعوت و عزیمت اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر بھرپور تبصرہ اور تجزیہ ملتا ہے۔ قرآن مجید میں تاریخی عوامل کے اس تجزیے نے مسلمان مؤرخین کو فن تاریخ نویسی میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ لغت عرب میں ''تاریخ'' کے معنی وقت سے آگاہ کرنے کے ہیں۔ اوقات کی یہی گردش مختلف اور متنوع وقائع کو جنم دیتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ مسلمان حقیقی تاریخ نویسی کے دنیا میں بانی اور مؤسس ہیں۔ اسلام سے قبل تاریخ نگاری ایک داستان طرازی تھی۔ مغربی مؤرخین کی یہ کوتاہی ہے کہ وہ تاریخ نویسی میں راویان تاریخ کے سلسلے اور کڑیوں کو واقعہ کے ساتھ مربوط نہیں کرتے' جبکہ مسلمان مؤرخین نے قرآنی تعلیمات کے اسلوب اور فن حدیث میں اسناد اور اسماء الرجال جیسے فن کے باعث واقعات کو براہِ راست راویوں کی شہادت، رویت یا سماعت سے مربوط کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ مسلمان مؤرخین کے ہاں تاریخ کے مفہوم میں ''عبر'' کا عنصر بھی شامل ہے کیونکہ وقائع نگاری میں تاریخ اگر آئینہ عبرت نہیں تو پھر اس کا مطالعہ اور افادیت دونوں مشکوک ہیں۔ یہی باعث ہے کہ فلسفۂ تاریخ کے بانی ابن خلدون (۷۳۲ھ-۸۰۸ھ) نے اپنی کتاب کا نام ''العبر و دیوان المبتداء والخبر'' رکھا ہے۔ فن تاریخ کی اس شہرۂ آفاق تصنیف کا اصل کمال اس کے مقدمے سے واضح ہوتا ہے، جس کے تراجم دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں کیے گئے۔ اہل مغرب نے بھی فن تاریخ نگاری میں ابن خلدون کی سبقت اور عظمت ہر دو کو تسلیم کیا ہے۔

تاریخ عالم میں مغرب نے فکر و دانش کے اعتبار سے جو انگڑائی لی، اس کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی سے ہوا۔ گزشتہ پانچ صدیوں میں مغرب نے علوم و فنون اور ایجادات کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے۔ علم و فن کے اس سفر میں اس نے بعض تاریخی

حقائق اور ابدی صداقتوں کو فراموش بھی کیا ہے، جن میں سب سے بڑی حقیقت خود مذہب ہے۔ دین و دنیا کی اس ثنویت میں انہوں نے مذہب کو سائنس کے راستے کا ڈاکو یا قزاق یا کم از کم رکاوٹ سمجھا ہے۔ اسی طرح دین وسیاست میں بھی ان کے ہاں ثنویت کا واضح عمل دکھائی دیتا ہے۔ ہر چند مغرب نے اپنی سیاسی ضروریات کے تحت چرچ سے یک گونہ تعلق قائم رکھا ہوا ہے اور مغرب کے موجودہ سربراہ یعنی امریکہ کے صدر بھی بائبل کی کتاب پر اپنا حلف اٹھانا ضروری سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مغرب نے سائنس اور سیاست ہر دو سے مذہب کی حقیقت کو نکال رکھا ہے جس کے باعث ان کی مذہب و ثقافت میں روحانیت کا اب کوئی زیادہ عمل دخل باقی نہیں رہا اور مغربی تہذیب فقط اور محض ایک مادی تہذیب ہے جسے تہذیبوں کی کشمکش کے موجودہ ہنگام میں ایک واحد عالمگیر قوت کے بطور تسلیم کرائے جانے کی استعماری تراکیب، استحصالی ہتھکنڈے اور ابلاغی مؤثرات اپنی پوری قوت سے برسر پیکار دکھائی دیتے ہیں۔

تہذیبوں کی اس کشمکش اور تاریخ کے اس پیکار کو مغرب میں جن دو بڑے مؤرخین نے اپنا موضوع بنایا اور اس پر سنجیدگی کے ساتھ اپنا قلم اٹھایا ہے ان میں سے ایک اوسوالڈ سپینگلر (Oswald Spengler) اور دوسرا پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی (Arnold Joseph Toynbee) ہے۔ اوّل الذکر مؤرخ نے "The Decline of the west" میں زوال مغرب کے سلسلے میں اپنے مطالعات کو دو حصوں میں پیش کیا ہے۔ پہلے حصے کے گیارہ ابواب میں اس عظیم کائنات کے عالمی تناظر کو پیش کرتے ہوئے جہاں اصول علیت اور تصور قضا و قدر کو پیش کیا گیا ہے، وہاں مختلف مذاہب، علوم، ثقافتوں اور تحریکوں کے حوالے سے اقوام کے زوال کے موضوع پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اسی کتاب کے دوسرے حصے کے چودہ ابواب میں کائنات کی اعلیٰ ثقافتوں کے طبقات، مختلف ثقافتوں کے درمیان روابط، شہری آبادیوں اور اس کے باشندوں کے مسائل، نسلی اور قومی مدنیت کے احوال، زبانوں اور ثقافتوں کے مسائل اور عرب ثقافت کے عناصر میں مجوسی روح اور فیثا غورثی عامل کی نوعیت کا ذکر کرتے

ہوئے فیثا غورث، حضرت محمد ﷺ اور کرامویل کا ایک غیر مربوط اور ناقابل فہم ذکر مابعد الطبیعاتی خوف کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے آخری پانچ ابواب اس اعتبار سے لائق تذکرہ ہیں کہ ان میں ریاستوں کی سیاسی صورتحال کے ساتھ ان کے مالیاتی اور معاشی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے قوموں کے عروج و زوال میں ان کی نوعیت اور کیفیت پر فلسفیانہ اسلوب میں کلام کیا گیا ہے۔ مگر پروفیسر ٹائن بی کے ہاں اوسلوالڈ سپنگلر کے اس نقطۂ نظر سے واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ ٹائن بی، سپنگلر کی طرح تہذیبوں کے عروج و زوال میں نسلی اور طبقاتی نوعیت کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس کی توجہ ثقافتی سطح پر زیادہ مرکوز رہتی ہے۔

پروفیسر آرنلڈ جوزف ٹائن بی (۱۴، اپریل ۱۸۸۹ء-۲۲، اکتوبر ۱۹۷۵ء) عہدِ حاضر کے معروف مؤرخین میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ برطانیہ کے معاشی مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی کا بھتیجا ہے جو برطانوی تہذیب کے مرکز لندن میں پیدا ہوا۔ ون چسٹر کالج (Winchester College) اور بلائل کالج (Balliol College) آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں بلائل کالج میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی پھر کنگز کالج لندن میں جدید یونان اور بازنطینیوں کی تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ لندن سکول آف اکنامکس اور رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل آفیئرز میں انتظامی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس آخری ادارے میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۵ء تک بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دیں۔ برطانوی وزارت خارجہ کے دفتر میں انٹیلی جنس برانچ میں بھی کام کرتے رہے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۹ء) کے سلسلے میں ۱۹۱۹ء میں پیرس کی امن کانفرنس کے وفد میں شامل ہوئے۔ "Survey of International Affairs" کے معاون مدیر رہے۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء) کے دوران اپنے ملک کے امور خارجہ کے شعبہ میں خدمات پیش کیں۔

ٹائن بی عہدِ حاضر کے ممتاز مؤرخین میں سے ایک ہیں۔ ان کا علمی شاہکار "A Study of History" بارہ جلدوں میں تحقیقی پیرائے میں لکھا گیا ہے جسے انہوں نے ۱۹۳۴ء سے

۱۹۶۱ء کے دوران ستائیس سالوں میں قلم بند کیا۔ کتاب کی آخری چار جلدوں میں قوموں اور تہذیبوں کے عروج وزوال سے بھی بحث کی گئی ہے۔ مغرب کے باقی ماندہ دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوئے، یہ ان کی دلچسپی اور تحقیقات کا خاص موضوع ہے، جسے انہوں نے اپنی گراں قدر تصنیف کی آٹھویں جلد میں تفصیلاً پیش کیا ہے۔ ان بارہ ضخیم جلدوں کی تلخیص بڑے سائز اور چھوٹے فونٹ کے ۵۷۶ صفحات میں ایک جلد میں کی گئی ہے۔ اس تلخیص میں مصنف کے ساتھ جین کیپلن (Jane Caplan) نے معاونت فراہم کی۔ اس اہم تلخیص میں ۵۰۷ وضاحتی تصویروں کے ساتھ ۱۲۳ اہم نقشے اور گوشوارے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں تہذیبوں کے آغاز، تیسرے باب میں ان کی نشوونما، چوتھے باب میں ان کے زوال اور پانچویں باب میں ان کی شکست وریخت سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے گیارہ ابواب کی ۵۴ ضمنی بحثوں میں فلسفۂ تاریخ سے لے کر تہذیبوں کی شکست وریخت جیسی اہم ابحاث کو پیش کیا گیا ہے۔ اس اہم تلخیص کا ایک اور خلاصہ ہمیں ٹائن بی کے ان چھ لیکچرز یا محاضرات میں ملتا ہے جو انہوں نے "The world and the west" کے عنوان سے ۱۹۵۲ء میں بی بی سی سے "Reith Lectures" کے عنوان سے دیے۔ انہی علمی اور تحقیقی خطابات یا محاضرات کا یہ مستند ترجمہ ''دنیا اور مغرب'' کے نام سے پیش نظر ہے۔

تاریخی شعور سے لبریز ان لیکچرز میں مغربی تہذیب کے دوسرے معاشروں پر اثر انداز ہونے کی کہانی ہے۔ وہ جہاں رومن امپائر کے زوال کی داستان سناتا ہے وہاں مغربی تہذیب کے عروج اور غلبے کی بات بھی کرتا ہے۔ ان تمام خطبات میں ایک اہم ترین اور مرکزی نکتہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب ایک ناقابل تقسیم اکائی یا وحدت ہے، جو معاشرہ اس تہذیب کے کسی ایک جزو یا پہلو کو قبول یا اختیار کرے گا تو یہ پوری تہذیب اپنی پوری قوت کے ساتھ ان قوموں اور ممالک میں در آئے گی۔ ٹائن بی کا یہ نقطۂ نظر محل تنقید ہے۔ ہمیں اس حقیقت کی اچھی طرح خبر ہے کہ ماضی قریب میں مغرب نے افریقی اور ایشیائی ممالک بالخصوص اسلامی ریاستوں پر اپنا سیاسی غلبہ حاصل کیا اور ان حصوں کو نوآبادیات کا درجہ دے

کران پر مدتوں حکمرانی کی اور ان کے معاشی اور انسانی وسائل کا بے دریغ اور بے تحاشا استعمال اور استحصال کیا۔ مغربی تہذیب و ثقافت کے عالم اسلام پر تین نوعیت کے اثرات و نتائج دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا تاثر تو مغرب اور ترکی کے درمیان دکھائی دیتا ہے کہ ترکی نے کمال اتاترک کی سیکولر قیادت میں تمام قوم کو مغربانے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی۔ دوسرا رویہ ان ممالک کا ہے، جن میں جزوی طور پر اس تہذیب کے بعض پہلوؤں کو اپنایا گیا اور بعض سے نفرت اختیار کی۔ یہاں ہمیں ایک تیسرا رویہ بھی ملتا ہے کہ جہاں اس تہذیب و ثقافت سے کلیۃً اختلاف، عناد اور استرداد کا رویہ اختیار کیا گیا۔ اگر کوئی ان تینوں رویوں کو بیک وقت کارفرما دیکھنا چاہتا ہے تو برصغیر کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ یہاں کے فیوڈل لارڈز اور بیوروکریسی نے مغربی تہذیب کی مکمل نمائندگی کا روپ دھارا۔ سرسید احمد خان نے جزوی طور پر ان کی تہذیب و ثقافت کے پہلوؤں کو اختیار کیا مگر تحریک مجاہدین، وہابی تحریک اور راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اس تہذیب و ثقافت کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اس کے سخت نتائج و عواقب کو برداشت کیا۔ اس لحاظ سے ہمیں ٹائن بی کے مذکورہ نظریے سے جزوی صداقت کے باوجود بھرپور اختلاف ہے۔

''دنیا اور مغرب'' کے ان لیکچرز میں ہم عصر تہذیبوں کے تصادمات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں پر ان خطابات کا خلاصہ یا تلخیص تو مناسب نہیں کیونکہ قارئین اس کے متن اور ترجمہ کو اپنے مقام پر دیکھ اور پڑھ لیں گے' البتہ ان لیکچرز یا محاضرات کی ترتیب اور عنوانات لائق توجہ اور قابلِ غور ہیں۔ پہلا خطبہ ''روس اور مغرب'' کے عنوان سے ہے۔ ٹائن بی کو اس امر سے اتفاق ہے کہ روس کئی لحاظ سے مغرب کا حصہ نہیں ہے۔ مغرب کی سرمایہ دارانہ تہذیب کے مقابلے میں مغرب ہی کے مفکرین کا برپا کردہ اشتراکی فلسفہ روس کے نظام حکومت اور طرز ثقافت کی بنا ٹھہرا۔ روس میں پیٹر پہلا حکمران ہے جس نے مغربیت کو اپنے خطے میں گھسنے کے مواقع فراہم کیے۔ ٹائن بی اشتراکیت کے نظریے کو ایک ہتھیار کے بطور تسلیم کرتا ہے مگر وہ کمیونزم کو ایک بدعت اور تباہی سے دوچار کرنے والا نظریہ قرار

دیتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ کارل مارکس کا تجویز کردہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔

دوسرا خطبہ ''اسلام اور مغرب'' کے حوالے سے ہے۔ گیارہویں سے سولھویں صدی عیسوی کے دوران مسلمان دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر غالب اور قابض ہوئے۔ مشرق میں برصغیر اور مشرق بعید کے تمام علاقوں میں ان کے اثرات موجود تھے۔ مشرق وسطیٰ تو ان کی تہذیب کا مرکزی خطہ تھا البتہ مغرب میں بہت سے افریقی علاقے ان کے مقبوضات میں شامل تھے۔ اندلس تو پہلے ہی ان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا اور اب ۱۶۸۳ء میں وی آنا کے مقام پر ترکوں کی ناکامی کے بعد مغرب کا جوابی حملہ جلد یا بدیر متوقع تھا۔ یہ پیش نظر رہے کہ مغرب نے خشکی پر مسلمانوں کے مقبوضات پر حملہ آور ہونے سے پہلے ان کی آبی گزرگاہوں پر قبضہ کیا جو زمینی تسلط کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ مغرب کے اسلام اور مسلمانوں پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ ہمارے پارلیمانی جمہوریت کے نظام' مغربی قوم پرستی کے تصورات اور نظام تعلیم کے حوالے سے واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ٹائن بی کا تیسرا خطبہ'' ہندوستان اور مغرب'' کے حوالے سے ہے۔

ہندوستان میں مغرب نے ہتھیاروں کے زور پر حکومت کی اور یہاں کے مقامی مسلم اقتدار کی توہین کی۔ اگر ہندوستان کو مسلم فاتحین نے فتح نہ کیا ہوتا تو مغرب کے لیے بھی یہاں پر قبضہ ناممکن تھا۔ اس باب میں ٹائن بی مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کو فوقیت دیتا ہے۔ فوقیت کا یہ طرز عمل برصغیر کی تقسیم تک کے ہر مرحلے میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس باب میں ٹائن بی کا یہ نقطۂ نظر بہت معنی خیز ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کا جو روحانی اثاثہ ہے' وہ یہودیوں اور عیسائیوں کا متروکہ ترکہ ہے' جسے دونوں قوموں نے اپنالیا ہے۔

ان خطبات کا چوتھا موضوع'' مشرق بعید اور مغرب'' کی داستان سناتا ہے جس میں بدھ مت کے غلبے کے حوالے سے مغربی اثرات کے نفوذ کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح مشرق بعید میں عیسائیت کو صنعتی عمل اور مغربی ثقافت کی بجائے ایک آفاقی مذہب کی حیثیت

سے متعارف کرایا گیا۔ یہاں عیسائی مذہب خود مغربی ثقافت کی گرفت میں دکھائی دیتا ہے۔

ٹائن بی کا پانچواں خطبہ ان تمام محاضرات کی روح کو پیش کرتا ہے۔ اس میں تہذیبوں کے تصادم کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ دنیا اور مغرب کے درمیان تصادموں کا مجموعہ ہی اس کتاب کا اصل اور حقیقی موضوع ہے۔ آخری خطبے میں ٹائن بی نے یونانیوں اور رومیوں کے تہذیب مغرب کے ساتھ تعلقات کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ رومیوں نے عیسائیت کو قبول کیا مگر ان کی مذہبی قیادت کو اس کی فکر مندی نہیں تھی کہ مسیح علیہ السلام کی سچی تعلیمات کیا ہیں؟ انہیں تو بس یہ فکر لاحق رہی کہ خود عیسائیت کا وجود اس لیے برقرار رہے کہ اس کے ساتھ ان کے غیر محدود مقاصد' اغراض اور مفادات وابستہ ہیں۔

ٹائن بی کے فلسفۂ تاریخ کا نچوڑ اور خلاصہ ان محاضرات میں سمٹ کر آ گیا ہے۔ مغرب میں مصنف کی اس فکر پر بہت تنقید ہوئی مگر کوئی مصنف کی تحقیقات کی مناسبت سے بڑی تنقید نہیں کر سکا۔ اس موضوع کے متاثرین میں مسلمان سرفہرست ہیں۔ ان کے مفکرین نے اپنی علمی اور ایمانی استعداد کے موافق مغرب کی تہذیب پر کڑی تنقید کی ہے جس کی نمائندہ اور شاہکار نگارشات علامہ محمد اقبال کے ہاں نظر آتی ہیں۔ علامہ اقبال نے اس تہذیب کا جو فکری پوسٹ مارٹم کیا ہے وہ ان کی نثر و نظم دونوں میں بہت نمایاں ہے اور اپنے حجم کے اعتبار سے سیکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ٹائن بی کے یہ خطبات مسلمانوں کو ابھی تک بالواسطہ دعوت فکر دے رہے ہیں کہ وہ اپنے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے لیے علم و تحقیق کے ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر اپنی روحانی' ایمانی اور اخلاقی قدروں کا دفاع کیسے کر سکتے ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ نصف صدی پہلے ٹائن بی نے تہذیبوں کے تصادم کے جس نقطۂ نظر کو پیش کیا تھا' اسی کی بنیاد پر یہودی مستشرق برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) نے "A Middle East Mosaic" نامی کتاب میں اس تصادم کی لے کو Encounter کی اصطلاح سے نکال کر Clash کی شکل دے دی ہے۔ برنارڈ لیوس کی کتاب میں جن باتوں کو

گھمبیر علمی اصطلاحات میں پیش کیا گیا ہے' ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ کے پروفیسر سیموئل پی ہنٹنگٹن (Samuel P.Huntington) نے اپنی کتاب ''تہذیبوں کے تصادم'' (Clash of Civilizations) میں اس فکر کو سہل ممتنع بنا کر پیش کر دیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تہذیبوں کے موجودہ تصادم میں اصل معرکہ آرائی کا میدان مسلمانوں اور اسلام کے درمیان ہے۔ وہ سیاسی سطح پر مسلمان حکمرانوں اور معاشروں کو گمراہ کرنے اور اسلامی فکر کو جدید دور کے تقاضوں سے ناآشنا ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ فرانسس فوکویاما نے اپنی کتاب ''خاتمہ تاریخ'' (The End of History) میں دنیا کے مستقبل کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے پیش نظر دنیا کی سیاسی شطرنج کے مہرے بڑی تیزی سے اپنی نشستیں بدلتے اور مات کھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مسلم ممالک کی پیادوں کی فوج اس بساط پر پٹ رہی ہے مگر کبھی کبھی پیادے بھی ایک بڑے ہیرو کا کردار ادا کرنے کی پوزیشن اور قوت حاصل کر لیتے ہیں اور اب کچھ ان شاء اللہ ایسا ہی ہونے والا ہے۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

ان فکر انگیز اور تاریخی شعور سے لبریز خطبات کا اردو ترجمہ محترم ڈاکٹر حسین احمد پراچہ صاحب نے کیا ہے جو ربع صدی تک دیار عرب میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد ان دنوں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر کی حیثیت سے علمی' تدریسی اور تحقیقی خدمات پیش کر رہے ہیں۔ اردو خواں احباب انہیں ''روزنامہ نوائے وقت'' میں ان کے کالم ''حکم اذاں'' کے حوالے سے پہچانتے ہیں کہ وہ کس قدر گہرا سیاسی ادراک' ملّی حمیّت' تجزیاتی بصیرت اور ابلاغی شعور رکھتے ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ ایک بے باک اور شعلہ بیاں مقرر کے طور پر مشہور تھے مگر اب ان کی دانش وری کا سکہ صحافت کے اوراق اور ٹیلی وژن کی سکرین دونوں پر چلتا ہے۔ ڈاکٹر پراچہ صاحب نے ان خطبات کا ترجمہ اپنے استاد اور اس عہد کے ممتاز دانشور' ادیب اور شاعر

ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کی فہمائش پر کیا۔ ان کے لیے یہ امر بھی موجب سعادت رہا کہ اس ترجمے پر نظر ثانی کا کام مرحوم پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے کیا جن سے بہتر اس دور میں قرآن کے تصور تاریخ اور مسلمانوں کے فلسفۂ تاریخ کا کوئی دوسرا طالب علم دکھائی نہیں دیتا۔ تہذیب مغرب کے آغاز وارتقا سے وہ بخوبی آگاہ تھے' یہی باعث ہے کہ مغرب پر تنقید کا وہ ایک خاص اسلوب رکھتے تھے۔ ترجمہ ایک فن اور تکنیک ہے' اہل نظر اس بات کی داد دیں گے کہ ڈاکٹر پراچہ صاحب نے ترجمہ کرتے ہوئے اسلوب کی شگفتگی اور وجاہت کو برقرار رکھا ہے۔ ہم اس کتاب کو بڑے اعتماد کے ساتھ اردو کے معیاری تراجم میں شامل کر سکتے ہیں۔ ادارہ ''نشریات'' کے محمد رفیع الدین حجازی نے اس کتاب کی پیش کش میں فنی تدوین اور املا کے جس معیار کو قائم کیا ہے' وہ لائق تحسین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مغرب اور ملت اسلامیہ کی موجودہ کشمکش کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے میں اس کتاب کا مطالعہ شاہ کلید ثابت ہوگا۔

۱۵ جولائی ۲۰۰۶ء

پروفیسر عبدالجبار شاکر
ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل
دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

عرض مترجم

پروفیسر ٹائن بی کی کتاب ''دنیا اور مغرب The World And The West" ان کے خطبات (Reith (Lectures کا مجموعہ ہے جو پروفیسر موصوف نے بی بی سی سے ۱۹۵۲ء میں دیے۔ ان خطبات میں ٹائن بی نے مغربی تہذیب کے دوسرے معاشروں پر اثر انداز ہونے کی کہانی بیان کی ہے۔ فاضل تاریخ دان کا ان خطبات میں مرکزی استدلال یہ ہے کہ مغربی تہذیب ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے جو معاشرہ بھی اس تہذیب کے کسی ایک جزو کو اپنے ہاں درآمد کرے گا آہستہ آہستہ پوری مغربی تہذیب اس معاشرے میں درآئے گی۔

استاذ گرامی پروفیسر ڈاکٹر سید خورشید رضوی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کروں۔ چونکہ میں خود بھی اس کتاب سے بہت متاثر تھا اور تہذیبوں کی باہمی اثر اندازی و اثر پذیری کے ضمن میں ٹائن بی کے تجزیے کے بعض پہلوؤں کی دل سے داد دے چکا تھا۔ اس لیے میں نے ان کے حکم پر خوشی خوشی سر تسلیم خم کر دیا مگر مجھے آغاز سفر سے ہی اس راستے کے کٹھن مقامات کا اندازہ ہو گیا اور جی میں آئی کہ اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دوں۔ تاہم استاذ گرامی کی پیہم اصرار میرے حوصلوں اور ہمتوں کی پستی پر غالب آئی اور میں نے بفضل تعالیٰ اس کام کو مکمل کر لیا۔ اس ضمن میں جناب ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں۔

اس کام کو مکمل کرنے کے بعد بھی میرا دل پوری طرح مطمئن نہ تھا لہٰذا میں نے برادر عزیز ڈاکٹر فرید احمد پراچہ کے توسط سے پروفیسر عبد الحمید صدیقی صاحب مرحوم سے درخواست کی کہ وہ سارے ترجمے پر نظر ثانی فرمائیں۔ پروفیسر صاحب مرحوم کی قیمت تو اس

کام کی چنداں متحمل نہ ہوسکتی تھی مگر انہوں نے کمال شفقت سے کام لیتے ہوئے وعدہ فرمایا کہ وہ سارے مسودے پر نظر ثانی فرمائیں گے۔اس دوران پروفیسر صاحب پر فالج کا حملہ ہوا' میں اسے پروفیسر صاحب کی انتہائی بلندی کردار اور انسانی عظمت تصور کرتا ہوں کہ جونہی انہیں فالج کی بیماری سے قدرے افاقہ ہوا انہوں نے کئی دوسرے کاموں پر نظر ثانی پر اس کام کو ترجیح دی اور بڑی دقت نظر سے سارے مسودے کی تصحیح فرمائی۔ میں اس شفقت و عنایت پر ان کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت النعیم میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

آخر میں محض رسم زمانہ کے تحت نہیں بلکہ اعتراف حقیقت کے طور پر یہ اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ترجمے میں اگر خوبی کا کوئی پہلو ہے تو اس کا سہرا پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب کے سر ہے' البتہ خامکاریوں کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہے۔اس ترجمے کے سلسلے میں قارئین اگر کوئی تصحیح فرمائیں یا کچھ مفید مشورے عنایت کریں تو میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں گا۔

ڈاکٹر حسین پراچہ
۳۰ جون ۲۰۰۶ء
انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

پیش لفظ

پیچھے مڑ کر دیکھا جائے تو دنیا اور مغرب کا آمنا سامنا شاید جدید تاریخ کا اہم ترین واقعہ ثابت ہو۔ یہ ایک ایسے تاریخی عمل کی بہت نمایاں مثال ہے جس کی ماضی میں اور بھی بہت سی مشہور مثالیں ملتی ہیں اور ہم عصر تہذیبوں کے ان تصادمات کی نہج اور نتائج کا تقابلی مطالعہ تاریخ انسانی کو سمجھنے کے لیے ایک کلید فراہم کرتا ہے۔

زیر نظر کتاب قاری کی نگاہ کے لیے ان Reith Lectures[1] کی ایک نقل مہیا کرتی ہے جو راقم الحروف ۱۹۵۲ء میں بی بی سی کی دعوت پر دیے۔ بی بی سی نے جب مجھ سے اس بات کی فرمائش کی کہ میں مذکورہ سال میں ان کا Reith Lectures کا مقرر بنوں تو انہوں نے ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی کہ میں اپنے موضوع کے طور پر کوئی ایسا عنوان اختیار کرلوں جس پر مفصل بحث میری کتاب ''تاریخ کا ایک مطالعہ'' A Study of History" کی آخری چار جلدوں میں شامل ہو جو اس وقت پریس میں ہیں اور ۱۹۵۴ء میں شائع ہو جائیں گی۔ میں نے ''دنیا اور مغرب'' کا عنوان منتخب کیا اور اب جب کہ اس موضوع پر Reith Lectures ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں اور The Listener کی حالیہ اشاعتوں میں چھپ بھی ہو چکے ہیں۔ انہیں یہاں ''تاریخ کا ایک مطالعہ'' کی باقی ماندہ جلدوں کے منظر عام پر آنے سے قبل یک جا شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کا مقصد یہ ہے کہ ایک سادہ اور مختصر انداز میں اس موضوع کا تعارف کرایا جائے جس پر ''تاریخ کا ایک مطالعہ'' کی آئندہ جلد ہشتم میں اتنی زیادہ تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ موجودہ پیش کش نہ تو ''مطالعہ تاریخ'' کے متعلقہ حصے (جلد ہشتم باب ۹) کی تکرار ثابت ہوگی

---

[1] J.C.W.Reith ڈائریکٹر جنرل بی بی سی ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۸ء

اور نہ جلد سات تا دس کی یک مجلدی تلخیص کے متعلقہ حصوں کی تکرار ہے جسے مسٹر D.E. Sd. Merweld اسی مہارت کے ساتھ تلخیص میں لانا چاہتے ہیں جو انہوں نے جلد اول تا ششم کی تکمیل میں دکھائی تھی۔

آرنلڈ جے ٹائن بی

دسمبر ۱۹۵۲ء

روس اور مغرب

شاید مصنف کے لیے اس کتاب کے موضوع سے قاری کو متعارف کرانے کا بہترین ذریعہ یہ ہوگا کہ وہ اس بات کی وضاحت کرے کہ اس نے کتاب کا یہ عنوان کیوں قائم کیا۔ قاری ❶ یا کتاب خواں اس بات پر الجھن محسوس کرسکتا ہے کہ آخر کتاب کو ''دنیا اور مغرب'' کا عنوان کیوں دیا گیا ہے؟ کیا دنیا کا وہ تمام تر حصہ جو دور حاضر میں کوئی عملی اہمیت رکھتا ہے۔ لفظ ''مغرب'' کے ذیل میں آ نہیں جاتا؟ اور بالفرض اگر مصنف کو باقی ماندہ غیر مغربی ''دنیا'' کے بارے میں کچھ کہنا ہی ہے تو بھی آخر اس نے ان دونوں لفظوں کو اس ترتیب سے کیوں رکھا ہے؟ اس نے ''دنیا اور مغرب'' کی جگہ ''مغرب اور دنیا'' کیوں نہیں لکھا؟ کم از کم اسے اتنا تو ضرور کرنا چاہیے تھا کہ ''غرب'' کو مقدم رکھتا۔ کتاب کا موجودہ عنوان سوچ سمجھ کر منتخب کیا گیا ہے۔ تاکہ دو ایسے نکتوں کی وضاحت ہوجائے جو موضوع بحث کو سمجھنے کے لیے ناگزیر معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ ''مغرب'' کبھی بھی دنیا کے تمام تر اہم حصے کو محیط نہیں رہا۔ مغرب اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی جدید تاریخ کے اسٹیج پر تنہا اداکار نہیں رہا اور اب تو شاید یہ نقطہ عروج گزر چکا ہے اس دوران دنیا نے مغرب پر ضرب نہیں لگائی بلکہ دنیا پر مغرب کی طرف سے ضرب لگی ہے اور یہ ضرب بڑی شدید تھی اور اسی مناسبت سے کتاب کے عنوان میں دنیا کو مقدم رکھا گیا ہے۔

ایک مغربی باشندہ جو اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہو اس کے لیے از بسکہ ضروری ہے کہ وہ چند لمحوں کے لیے اپنے مانوس مغربیت کے خول سے باہر نکل آئے اور دنیا اور مغرب کے مابین تصادم کو نوع انسانی کی غیر مغربی اکثریت کی آنکھوں سے دیکھے، اگرچہ دنیا کی غیر

❶ یہاں ''قاری'' سے مراد ''مغربی قاری'' ہے جس کی نگاہ میں غیر مغربی دنیا اتنی غیر اہم ہے کہ قابل ذکر ہی نہیں۔

مغربی اقوام' نسل' زبان' تمدن اور مذہب میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں تاہم اگر کوئی مغربی مغرب کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرے تو وہ ان سب کی طرف سے ایک ہی جواب سنے گا خواہ وہ روسی ہوں یا مسلمان یا ہندو یا چینی' جاپانی یا کچھ اور۔ یہ سب اسے یہی بتائیں گے کہ وہ چھٹا ہوا جارح ہے۔ اہل روس اسے یاد دلائیں گے کہ ان کے ملک پر مغرب کی میدانی فوجوں نے ۱۶۲۰ء ۱۷۰۹ء ۱۸۱۲ء ۱۹۱۵ء اور ۱۹۴۱ء میں حملہ کیا تھا۔ افریقہ اور ایشیا کے لوگ انہیں یاد دلائیں گے کہ سمندر پار کے مغربی تبلیغی ادارے سے تاجر اور سپاہی ان کی بندرگاہوں کے ذریعے پندرھویں صدی سے ان کے ملکوں میں گھسے چلے آتے ہیں۔ ایشیائی انہیں یاد دلائیں گے کہ اسی عرصہ میں اہل مغرب نے دنیا کے آخری خالے علاقے کے کثیر حصہ پر قبضہ کر لیا تھا جس میں امریکہ' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور جنوبی اور مشرقی افریقہ شامل ہیں۔ افریقی انہیں یاد دلائیں گے کہ انہیں غلام بنایا گیا اور انہیں بحر اوقیانوس کے پار جہازوں میں بھر بھر کے بھیجا گیا تاکہ وہ امریکہ میں بس جانے والے یورپی آباد کاروں کی ہوس زرگیری کے لیے زندہ مشینوں کا کام دے سکیں۔

شمالی امریکہ کی اصل آبادی کی موجودہ نسل انہیں یاد دلائے گی کہ ان کے آباؤ اجداد کو وہاں سے نکال باہر کیا گیا تاکہ وہاں مغربی یورپ کے زبردستی گھس آنے والوں اور ان کے افریقی غلاموں کے لیے جگہ خالی کرائی جا سکے۔

درج بالا سطور میں عائد کی گئی فرد جرم اکثر اہل مغرب کو حیران اور رنجیدہ خاطر کرے گی اور شاید وہ اس کی تاب نہ لاتے ہوئے آپے سے باہر ہو جائیں۔ ولندیز کے اہل مغرب اچھی طرح باخبر ہیں کہ انہوں نے انڈونیشیا کو اور برطانوی اہل مغرب واقف ہیں کہ انہوں نے ۱۹۴۵ء سے ہندوستان' پاکستان' برما اور سیلون کو خالی کیا ہے۔

برطانوی اہل مغرب کے ضمیروں پر ۱۸۹۹ء-۱۹۰۲ء کی جنوبی افریقہ کی جنگ کے بعد اور کسی جارحانہ جنگ کا بوجھ نہیں اور امریکی اہل مغرب کے ضمیروں پر اسپین اور امریکہ کی ۱۸۹۸ء کی لڑائی کے بعد کسی جارحانہ جنگ کا بوجھ نہیں۔

ہم یہ بڑی آسانی سے بھول جاتے ہیں کہ جرمن جنھوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں روس سمیت اپنے پڑوسیوں پر حملہ کیا وہ بھی افرنگی ہیں۔ روسی ایشیائی اور افریقی اہل مغرب کے مختلف گروہوں میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچتے۔ اہل مغرب کے لیے ''افرنگ'' کا نام اقوام عالم میں بہت مقبول ہے۔

جب دنیا مغرب کے متعلق فیصلہ دیتی ہے تو اسے لاطینی محاورے کے مطابق اپنے فیصلے کے حتمی ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ دنیا کا مغرب سے متعلق فیصلہ جو کہ ساڑھے چار سو سالوں پر پھیلا ہوا ہے، درست ہی معلوم ہوتا ہے۔

اس تمام عرصے میں مغرب کے متعلق دنیا کا یہی تجربہ رہا ہے کہ مغرب جارح ہے اور آج جب کہ حالات کا پانسہ چین اور روس نے مغرب کے خلاف پلٹ دیا ہے۔ یہ اس داستان کا ایک باب ہے جس کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک نہ ہوا تھا۔ روس اور چین کے مغربی نو آبادیوں پر حالیہ جارحانہ حملوں نے اہل مغرب کے لیے خطرے اور ناراضی کا سامان مہیا کیا ہے اور یہ اس امر کی کھلی شہادت ہے کہ ہم اہل مغرب کے لیے ابھی تک یہ انوکھا تجربہ ہے کہ ہم دنیا کے ہاتھوں سے نقصان اٹھائیں وہ نقصان کہ جو دنیا کئی صدیوں تک ہمارے ہاتھوں سے اٹھاتی رہی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کو مغرب سے کیا تجربہ حاصل ہوا۔ آیئے روس کے تجربہ سے آغاز کریں کیونکہ روس غیر مغربی دنیا کا عظیم حصہ ہے۔ اگرچہ روسی عیسائی رہے ہیں اور ان میں سے کچھ ابھی تک عیسائی ہیں مگر وہ کبھی بھی ''مغربی عیسائی'' نہیں رہے۔ روس میں مذہب کی تبدیلی قسطنطنیہ کے ذریعے سے ہوئی نہ کہ روم کے ذریعے سے جیسا کہ انگلینڈ میں ہوا تھا۔ اگرچہ مشرقی اور مغربی دنیائے مسیحیت کا مبدأ ایک ہی تھا تاہم یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے غیر رہے اور ان کا رویہ ایک دوسرے کے بارے میں مخالفانہ ومخاصمانہ رہا ہے۔ بدقسمتی سے آج تک روس اور مغرب کا ایک دوسرے کے بارے میں یہی مخالفانہ رویہ قائم ہے جبکہ دونوں ملک تاریخ کے مسیحی دور سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔

اگر چہ روس کے مغرب کے ساتھ تعلقات کی داستان مجموعی طور پر ناخوشگوار ہے تاہم اس کا ابتدائی باب خاصا خوش گوار تھا۔ اگر چہ روس اور مغرب کے طرز زندگی میں بڑا گہرا اختلاف پایا جاتا ہے تاہم ازمنہ وسطیٰ میں دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ اچھا نباہ ہوتا رہا ہے۔ دونوں ملکوں کے لوگ آپس میں تجارت کرتے تھے اور شاہی خاندان آپس میں شادی بیاہ کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک انگریز بادشاہ ہیرلڈ کی لڑکی کی شادی ایک روسی شہزادے کے ساتھ ہوئی۔ دونوں ملکوں کی آپس میں بیگانگی کا آغاز تیرھویں صدی میں ہوا جب تاتاریوں نے روس کو تسخیر کر لیا تھا۔ تاتاریوں کا روس پر غلبہ عارضی ثابت ہوا۔ کیونکہ تاتاری سائبریا کے لق ودق صحراؤں کے خانہ بدوش تھے اس لیے وہ روس کے میدانوں اور جنگلوں کو اپنا گھر نہ بنا سکے۔

روس کے دائمی نقصانات تاتاری فاتحین کی بدولت نہ تھے بلکہ وہ نقصانات روس کے مغربی ہمسایوں کی وجہ سے تھے۔ انہوں نے روس کی پست ہمتی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا۔ انہوں نے سفید روس کے مغربی کناروں کو اور یوکرین کے مغربی نصف حصے کو ''مغربی مسیحی'' حکومت میں شامل کر لیا۔ روس ۱۹۴۵ء میں دوبارہ ان علاقوں کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں لے سکا جو مغربی طاقتوں نے تیرھویں اور چودھویں صدی میں اس سے چھین لیے تھے۔

ازمنہ وسطیٰ کے آخر میں مغرب کی روس میں ان فتوحات نے جہاں روس کی داخلی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کیے وہاں مغرب کے ساتھ روس کے تعلقات پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ روس پر مغرب کے دباؤ نے اسے نہ صرف مغرب سے بیزار کیا بلکہ اہل روس کو ایک تلخ حقیقت سے بھی آشنا کیا۔ اس حقیقت نے روسیوں کو مجبور کیا کہ وہ ایک نئی مطلق العنان روسی حکومت کا جوا اپنے گلے میں پہن لیں جس کا صدر مقام ماسکو ہو۔ اس دباؤ نے روسیوں پر واضح کر دیا کہ اگر روس باقی رہنا چاہتا ہے تو اس کے ہاں مکمل طور پر سیاسی یک جہتی ہونی ضروری ہے۔ اگر چہ اہل روس کو اس سیاسی یک جہتی کی قیمت مطلق العنانیت کی شکل میں ادا

کرنا پڑی۔ یہ کوئی حادثہ نہ تھا کہ روس کی نئی متحدہ حکومت کا صدر مقام ماسکو کو بنایا گیا بلکہ اس میں یہ حکمت مضمر تھی کہ روس کا جو علاقہ مغربی حملہ آوروں کی زد سے ابھی تک بچا ہوا تھا۔ اس میں ماسکوان کے بحری راستے میں تھا۔ اہل پولینڈ نے ۱۶۱۰ء، فرانسیسیوں نے ۱۸۱۲ء اور جرمنوں نے ۱۹۴۱ء میں روس پر اسی راستے سے حملہ کیا۔

چودھویں صدی کی ابتدا سے روس میں تمام حکومتوں کا طرۂ امتیاز مطلق العنانیت اور مرکزیت رہا ہے۔ روس کی یہ قدیم سیاسی روایت اہل روس کے لیے بھی اسی قدر ناپسندیدہ تھی جیسے اس کے ہمسایوں کے لیے تھی۔ لیکن بدقسمتی سے روسیوں نے اس روایت کو پوری طرح نبھایا اس کی شاید ایک وجہ تو ان کی شاہ پسند طبیعت تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ''مطلق العنانیت'' کو ہمسایوں کے بیرونی غلبہ کے مقابلے میں ایک معمولی برائی خیال کرتے تھے۔

مطلق العنانیت کے بارے میں روسیوں کا یہ طرز عمل ایک روایت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور ہم اہل مغرب کے نزدیک روس اور مغرب کے آج کے تعلقات کے سلسلے میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ مغرب میں لوگوں کی اکثریت کے نزدیک جابرانہ حکومت ایک ناقابل برداشت معاشرتی برائی ہے۔ جب مغرب میں استبدادی حکومت نے فاشزم اور ''قومی سوشلزم'' کے روپ میں سر اٹھایا تو ہمیں اسے دبانے کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ ہم مطلق العنان حکومت کے روسی برانڈ کے بارے میں (کہ جیسے سیزر ازم یا کمیونزم کہا جاتا ہے) نفرت اور بدگمانی کے جذبات رکھتے ہیں۔ ہم استبدادی حکومت کے اس روسی برانڈ کو پھلتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے اور ہم خاص طور پر اسے مغرب کی ''آزادی'' کے نصب العین کے لیے زبردست خطرہ سمجھتے ہیں۔ ہم اہل افرنگ خود کو ترکوں کے وی آنا کے ۱۶۸۴ء کے محاصرہ کے بعد تاریخ میں پہلی مرتبہ دفاعی حالت میں دیکھ رہے ہیں اور جنگ کے روسی خطرہ کے بارے میں ہماری حالیہ پریشانی بھی کچھ بے بنیاد نہیں ہے، یہ دوں پر قائم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ ۱۹۴۵ء سے روس کے جو تعلقات

مغرب کے ساتھ ہیں وہ اس کے برعکس نہیں ہونے چاہئیں اور ہمیں حال کے ان تعلقات کی روشنی میں ماضی کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اور جب ہم روس اور مغرب کے تصادم کو ایک صحافی کی نگاہ سے نہیں بلکہ ایک تاریخ دان کی نظر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ (کئی صدیوں کی مدت میں کہ جس کا خاتمہ ۱۹۴۵ء پر ہوتا ہے) روس کے ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھنے کی وہی وجہ تھی جس کی بنا پر آج ہم روس کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ آخری چند صدیوں میں مغرب کی طرف سے روس کے لیے وہ خطرہ جو تیرھویں صدی سے لے کر ۱۹۴۵ء تک برقرار رہا اور بھی شدید ہوگیا اس کی وجہ مغرب میں صنعتی انقلاب کا رونما ہونا تھا جو کہ اب ایک پرانے مرض کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اس خطرے کے بظاہر کم ہونے کے کوئی امکانات نظر نہیں آتے۔

جب مغرب میں آتشیں ہتھیاروں کا رواج عام ہوا تو روسیوں نے اس کی تقلید کی اور سولہویں صدی میں اس نے مغرب سے یہ ہتھیار لے کر وادی وولگا کے تاتاریوں کو اور یورال اور سائبیریا کی وحشی قوموں کو فتح کرنے کے لیے استعمال کیے لیکن ۱۶۱۰ء میں اہل پولینڈ ہتھیاروں کی برتری کے بل بوتے پر اس قابل ہوئے کہ وہ ماسکو پر قبضہ کرلیں اور اسے دو سال تک اپنے قابو میں رکھیں۔ اور اسی زمانے میں اہل سویڈن اس قابل تھے کہ وہ روس کو بحیرہ بالٹک اور خلیج فن لینڈ میں داخلے سے باز رکھیں۔

سترھویں صدی میں افرنگ کے ان جارحانہ اقدام کا جواب اہل روس نے مغرب کی صنعتوں کو مکمل طور پر اپنا کر دیا۔ اور اس کے ساتھ اس قدر مغربی طرز زندگی کو بھی اختیار کرلیا جس کی مغربی صنعتوں سے علیحدگی ممکن نہ تھی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی کا روس میں آنے والا صنعتوں کا انقلاب اپنے ساتھ معاشرتی تبدیلیاں بھی لایا۔ یہ انقلاب قدیم روس کی مطلق العنان حکومت کے ایک غیر معمولی ذہانت رکھنے والے حاکم کے ایک حکم سے برپا ہوا جس کا نام عظیم پیٹر تھا۔ پیٹر کے حوالے سے ہم نہ صرف روس اور مغرب کے تعلقات کو بلکہ مغرب کے ساری دنیا کے ساتھ تعلقات کو سمجھ سکتے ہیں کیونکہ پیٹر وہ پہلا مصلح تھا جس نے

اپنے ملک میں مغربیت کو رائج کیا۔ یہ پیٹر وہی تھا جس نے دنیا کو اڑھائی صدیوں تک مکمل مغربی غلبے سے بچائے رکھا اور اس نے دنیا کو مجبور کیا کہ وہ اہل مغرب کا ان کے ہتھیاروں سے مقابلہ کرے۔

ترکی میں سلطان سلیم سوم، محمود دوم اور کمال اتاترک اور مصر میں محمد علی پاشا مغربیت کے پرچارک تھے۔ جاپان کے عظیم مدبرین ۱۸۶۰ء میں وہاں مغربی انقلاب لائے۔ یہ سب لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر عظیم پیٹر کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ پیٹر نے روس کو صنعتی دوڑ میں مغرب کے مقابل لا کھڑا کیا۔ روس ابھی تک چین سے نہیں بیٹھ سکا کیونکہ مغرب مسلسل روس کے خلاف برسر پیکار ہے۔ پیٹر اور اس کے اٹھارویں صدی کے جانشینوں نے روس کو مغرب کے پہلو بہ پہلو چلانے کے لیے جاں توڑ محنت کی۔ تاکہ وہ سویڈن کے مغربی حملہ آوروں کو ۱۷۰۹ء میں اور فرانس کے مغربی حملہ آوروں کو ۱۸۱۲ء میں شکست دے سکیں۔ لیکن انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب کی بدولت مغرب ایک مرتبہ پھر روس کو پیچھے چھوڑ گیا اور اسی لیے روس کو پہلی جنگ عظیم میں مغرب کے جرمن حملہ آوروں کے ہاتھوں شکست ہوئی جیسے اسے دو سو سال پہلے پولینڈ اور سویڈن سے ہوئی تھی۔ روس کی موجودہ مطلق العنان حکومت مغربی صنعتی کلچر سے شکست کے نتیجے میں اس قابل ہوئی کہ وہ زاروں کی جگہ لے سکے۔ کمیونسٹ حکومت نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۱ء تک روس کے لیے وہی کچھ کیا جو سینئر راور پیٹر نے دو سوتیس سال پہلے کیا تھا۔

روس کو اپنی تاریخ کے جدید باب میں دوسری مرتبہ ایک مطلق العنان حاکم نے زبردستی مغربی صنعتی کلچر اختیار کرنے کی راہ پر ڈال دیا۔ تاہم سٹالن کا روس کو صنعتی میدان میں مغرب کی پیروی پر لگانا جنگی نقطہ نظر سے درست تھا۔ روس میں کمیونسٹوں کے لائے ہوئے صنعتی انقلاب نے دوسری جنگ عظیم میں جرمن حملہ آوروں کو شکست دی جیسے پیٹر نے ۱۷۰۹ء میں سویڈن کے حملہ آوروں کو اور ۱۸۱۲ء میں فرانس کے حملہ آوروں کو دی تھی اور پھر ۱۹۴۵ء میں روس کے علاقوں کی جرمن قابضین سے مکمل آزادی کے حصول کے چند ماہ بعد روس کے

امریکی اور مغربی اتحادیوں نے جاپان پر ایٹم بم گرایا اور یہ مغرب کے تیسرے صنعتی انقلاب کا اعلان تھا۔

اور اب روس تیسری مرتبہ مغرب کا صنعتی میدان میں مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن مغرب اسے پھر پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل گیا ہے۔ روس اور مغرب کے اس مسلسل مقابلے کا نتیجہ ابھی تک مستقبل کی دھندلاہٹوں میں چھپا ہوا ہے تاہم اتنی بات تو پہلے سے واضح ہے کہ صنعتی دوڑ کی تجدید ان دو پرانی مسیحی حکومتوں کے تعلقات کی راہ میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوگی۔ صنعتی اوزاروں کے تھیلے کا ایک طویل یونانی نام ہے۔ اور ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ وہ کون سے ہتھیار ہیں جو ہتھیاروں کے اس مقابلے میں طاقت کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

ایک پاور لوم یا ایک ریلوے انجن اس مقصد کے لیے اسی طرح ایک ہتھیار کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے بندوق ہوائی جہاز یا بم۔ لیکن دنیا میں تمام ہتھیار مادی قسم کے ہی نہیں ہوتے بلکہ دنیا میں روحانی ہتھیار بھی پائے جاتے ہیں اور یہ ان تمام ہتھیاروں میں سب سے زیادہ موثر ہیں جو انسان نے بنائے ہیں۔ مثال کے طور پر نظریہ بھی ایک ہتھیار ہو سکتا ہے۔ روس نے مغرب سے اپنے مقابلے کے نئے دور میں (جس کا آغاز ۱۹۱۷ء سے ہوا) اپنے ترازو کے پلڑے میں نظریے کا وزن ڈال دیا جس کا وزن مغرب کے مادی ہتھیاروں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا۔

کمیونزم ایک ہتھیار ہے اور یہ اسی طرح مغربی الاصل ہے جیسے بم ہوائی جہاز اور بندوقیں وغیرہ۔ اگر کمیونزم کا نظریہ انیسویں صدی کے دو مغربی مصنفوں کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز نے پیش نہ کیا ہوتا (جو ہالینڈ میں پلے بڑھے اور جنھوں نے اپنی زندگیوں کے پڑھنے لکھنے کا بہترین حصہ لندن اور مانچسٹر میں گزارا۔ تو کمیونزم کبھی بھی روس کا سرکاری نظریہ نہ ہوتا۔ روس کی روایت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو روسیوں کو کمیونزم ایجاد کرنے کی طرف راغب کرتی اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اگر یہ نظریہ تیار شدہ حالت میں مغرب میں

موجود نہ ہوتا تو روس کی انقلابی حکومت کبھی اس نظریہ کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ روس نے مغرب کی پیروی میں صنعتی انقلاب لانے کے ساتھ ساتھ مغرب کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اسی کا نظریہ مستعار لے لیا۔

بالشویکوں نے ۱۹۱۷ء میں روس کی تاریخی روایت سے زبردست انحراف کیا۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے روس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نظریہ باہر سے درآمد کیا۔ ہم اس امر کا پہلے ہی ذکر کر آئے ہیں کہ روس میں عیسائیت بازنطین سے آئی نہ کہ مغرب سے جہاں عیسائیت کی ظاہری حقیقت اور روح مغرب سے بالکل الگ اور بہت مختلف تھی۔

پندرھویں صدی میں مغرب نے روس پر ''مغربی طرز'' کی عیسائیت نافذ کرنے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔ ۱۴۳۹ء میں فلورنس کے مقام پر اہل کلیسا کا ایک اجتماع ہوا جس میں اس وقت کی رہی سہی بازنطینی حکومت کی طرف سے کلیسا کی مشرقی روایت کے نمائندوں نے بھی شرکت کی اور بادل ناخواستہ اس امید پر رومی اسقف اعظم کی برتری کو تسلیم کر لیا کہ اس کے صلے میں مغربی دنیا قسطنطنیہ کو ترکوں کی تاراج سے بچالے گی۔

ام البلاد ماسکو کے اسقف اعظم بھی (جو قسطنطنیہ کے یونانی کلیسا کے نمائندہ پادری کی حیثیت رکھتے تھے) مجلس شوریٰ میں شریک تھے انہوں نے بھی اسی طرح رائے دی جیسے ان کے یونانی تقلید پرست چرچ کے بھائیوں نے دی۔ جب یہ پادری ماسکو واپس پہنچا تو اس کے پوپ کی برتری تسلیم کرنے کے فیصلے کی زبردست مخالفت ہوئی جس کے نتیجے میں اسے معزول کر دیا گیا۔

اڑھائی سو سال قبل جب عظیم پیٹر مغربی صنعتی علم کو حاصل کرنے کے لیے مغرب گیا تو اس وقت یہ سوال باقی نہ رہا کہ روس کو مغربی صنعت آموزی کی قیمت مغربی طرز عیسائیت کو اپنا کر ادا کرنی پڑے گی۔

سترھویں صدی کے اختتام سے قبل مغرب میں نہ صرف مذہبی جنون کے خلاف بلکہ خود مذہب کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ یہ ردعمل دراصل مغرب کی ان مذہبی جنگوں سے تھکن کا

نتیجہ تھا جو ان کے ہاں مدتوں سے لڑی جارہی تھیں۔ روس کا پیٹر جس زمانے میں مغرب کا شاگرد بنا اس وقت روس ایک دینی ملک تھا۔ روسی دانشوروں کی اقلیت نے جو روس میں مغربیت رائج کرنے کی ایجنٹ تھی اپنے ہم عصر مغربی دانشوروں کی قائم کردہ مثال کی پیروی کی۔ ان دانشوروں نے روسی عیسائیت کے خلاف مغربی عیسائیت کو اپنائے بغیر سرد مہری کا رویہ اختیار کرلیا۔ اس طرح ۱۹۱۷ء میں روس نے کمیونزم کو اپنا کر اپنی تاریخی روایت سے زبردست انحراف کیا ہے کیونکہ اس نے تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی مغربی نظریے کو اپنایا ہے۔ قاری نے یہ بات بھی نوٹ کی ہوگی کہ روس نے ۱۹۱۷ء میں جو مغربی نظریہ اپنایا وہ اس کے مغربی دنیا کے خلاف روحانی جنگ لڑنے کے لیے بہت ہتھیار ثابت ہوا۔

مغرب میں کہ جہاں یہ نظریہ تخلیق ہوا ایک بدعت شمار کیا گیا۔ یہ نظریہ مغرب کی مذہبی ناکامی کے خلاف ایک مغربی تنقید تھی کہ مذہب کا سختی سے پابند معاشرہ بھی مسیحی اصولوں کے تحت اپنی معاشی اور معاشرتی زندگی کو کامیابی سے نہ چلا سکا۔ کمیونزم ایک مغربی الاصل نظریہ تھا جو بیک وقت مغربی طرز زندگی کے خلاف فرد جرم بھی عائد کرتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک روحانی ہتھیار بھی تھا جسے مغرب کے مخالفین اس کے بنانے والوں کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ روس یہ مغربی روحانی ہتھیار اپنے ہاتھ میں لے کر مغربی ملکوں کے اندر خیالات کے میدان میں اپنی جنگ جاری رکھ سکتا تھا۔

چونکہ کمیونزم مغرب کی مصیبت زدہ روح کی تخلیق تھا اس لیے مغرب کے دوسرے مصیبت زدہ اذہان کو اپنی طرف مائل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جب اس نظریے کی شعاعوں کو روسی پراپیگنڈے کی مدد سے پھینکا گیا تو کچھ لوگ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مغربی دنیا کی تاریخ جدید میں سترھویں صدی کے اختتام کے بعد یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ جب اہل مغرب نے مکمل طور پر اسلام قبول کرنے سے کنارہ کشی کرلی تو مغرب کو ایک مرتبہ پھر داخلی روحانی شکست وریخت کا شدید احساس ہوا۔

مغرب کی اپنی تعمیر کردہ بنیادوں پر مغربی تہذیب کی حیثیت کو کم کیا جارہا ہے۔ کمیونزم

نے روس میں خود کو مغربی تہذیب کے خلاف ایک موثر ہتھیار ثابت کیا ہے اور یہ روحانی ہتھیار کسی بھی مادی ہتھیار سے زیادہ قوت اثر پذیری رکھتا ہے۔ کمیونزم نے نوع انسانی کے چینی زیر اثر علاقے اور دنیا کی غیر جانبدار اکثریت کو روسی کیمپ میں لانے کے لیے روس کی بہت مدد کی۔ ہم جانتے ہیں کہ غیر جانبدار لوگوں کی تائید حاصل کرنے کی دوڑ کے نتیجہ کی حیثیت روس اور مغرب کی مجموعی باہمی کشمکش میں فیصلہ کن ہوگی کیونکہ دنیا کی غیر جانبدار اکثریت کی روس اور مغرب کی عالمی طاقت بننے کی دوڑ فیصلہ کن ووٹ کی حیثیت ہوگی۔

اب روس ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے پسے ہوئے کسانوں سے ان کے دوہرے فائدے کے نام پر اپیل کر سکتا ہے۔ روس کا نمائندہ ایشیائی نمائندوں کو پہلے نمبر پر تو یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر تم روس کی مثال پر عمل کرو تو کمیونزم تمہیں مغرب کے مقابلے پر کھڑا ہونے کی قوت بخشے گا۔ دوسرے نمبر پر ایشیا کی دیہی آبادی کو یہ اپیل کر سکتا ہے کہ وہ ان کو اس شدید قسم کی عدم مساوات سے نجات دلا سکتا ہے جو دولت مند اقلیت اور افلاس و نکبت کی ماری ہوئی اکثریت میں پائی جاتی ہے جب کہ ''آزادانہ حیثیت'' انہیں باوجود خواہش کے بھی اس غیر منصفانہ تقسیم سے نجات نہیں دلا سکتی۔ کمیونزم کی یہ اپیل صرف غیر مطمئن اہل ایشیا کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔ کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اتحاد کی علمبردار ہے اور اتحاد ہی اس ایٹمی دور میں ہمیں تباہی و بربادی کے جہنموں سے بچا جا سکتا ہے۔ اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ روس اور مغرب کے اس نظریاتی تصادم کے آغاز میں روس صنعتوں کی دوڑ میں بہت آگے نکل گیا۔

ہم مغرب کے باسی خود کو اس کمیونزم کے حوالے نہیں کر سکتے جسے روس نے اختیار کر رکھا ہے کیونکہ یہ مغرب کی ہی پیدا کردہ بدعت ہے جسے اہل مغرب کی اکثریت ایک گمراہ کن اور تباہی سے دوچار کرنے والا نظریہ خیال کرتی ہے۔

ایک عالم دین اس بات کو یوں پیش کر سکتا ہے کہ ہمارے دور جدید کے عظیم بدعتی کارل مارکس نے گمراہ کن قسم کی علمی غلطی کی اور زبردست انحراف کیا۔ قدیم طریق کے

مطابق کارل مارکس نے اپنی انگلی صرف ایک نقطے پر رکھ دی اور اس میں اصلاح ن
زبردست ضرورت کا احساس دلایا لیکن باقی تمام امور کو نظر انداز کر دیا۔ اسی وجہ سے اس ت
تجویز کردہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ نقصان دہ تھا۔

روس نے اپنی موجودہ فتح کے آغاز میں کمیونزم کی مغربی بدعت کو اپنایا اور اس کی شعاعیں مغرب دشمنی کی زہریلی گیس کے بادلوں میں لپیٹ دنیا پر پھینکیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ نظریہ اب دنیا کا مقدر ہو چکا ہے۔ مارکس کی بصیرت غیر مارکسی نگاہوں کو اس قدر محدود اور سرابوں میں لپٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ یہ مستقل طور پر انسانوں کے دل و دماغ کو متاثر نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ اب تک کمیونزم کو جو فتح حاصل ہوئی اس کے بارے میں ابھی تک کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ یہ ہمیں جو کچھ بتلاتا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوا ہے کہ روس اور مغرب کا تصادم اب صنعتی میدان سے نکل کر نظریاتی میدان میں پہنچ گیا ہے۔

اس کہانی کے اگلے باب میں (کہ جو ابھی تک مستقبل کی دھند میں لپٹا ہوا ہے)۔ پرانی تاریخ کے یونان اور روم کے ابتدائی تصادم کے حوالے سے کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن اس روشنی کو دیکھنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ مغرب اور روس کے اسلام یا ہندوستان اور مشرق بعید سے تصادم نے ان پر کیا اثرات مرتب کیے۔

اسلام اور مغرب

پہلے باب میں مغرب کے روس کے ساتھ تصادم کے بارے میں جو بحث کی گئی ہے اس کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے دو باتیں کھل کر سامنے آ جاتی ہیں' اول یہ کہ روس نے اپنی آزادی کو مغربی استعمار سے بچانے کے لیے مغربی طور طریقے اپنائے۔ دوم یہ کہ روس نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مغرب کے جن ذرائع کو قبول کیا ان میں سے ایک ذریعہ نظریہ کا تھا۔ مغربی نظریہ کمیونزم اختیار کرنے سے روس اس قابل ہو گیا کہ وہ اپنی دفاعی حالت کو جارحانہ حالت میں بدل دے اور یہی چیز آج مغرب میں ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ روس کے ہمارے مغربی معاشرہ کے ساتھ تعلقات کی داستان خود ہمارے دور میں کئی لحاظ سے ایک قصہ پارینہ کی صدائے بازگشت ہے جس میں جدید مغربی تہذیبوں کا کردار اس کی پیشرو یونانی اور رومی تہذیبوں نے ادا کیا جب کہ روس کا کردار ادا کرنے میں اسلام پیش پیش تھا۔

کمیونزم کو عیسائیت میں رائج ایک بدعت قرار دیا گیا ہے اور یہی بیان اسلام پر بھی صادر آتا ہے۔ اسلام نے بھی کمیونزم کی طرح اس زمانے کی عیسائیت میں پیدا شدہ غلط رسوم کی بیخ کنی کے لیے اصلاحی لائحہ عمل پیش کر کے اپنے لیے راہ پیدا کی اور اسلام کی اپنے ابتدائی دور میں کامیابی ظاہر کرتی ہے کہ کسی اصلاحی بدعت میں کس قدر زبردست کشش پائی جاتی ہے خاص طور پر اس وقت جب کہ یہ قدیم نظریہ پر کاری ضرب لگا رہی ہو مگر وہ اپنی اصلاح سے گریزاں ہو۔

مسیحی دور کی ساتویں صدی عیسوی میں مسلمان عربوں نے خود کو یونان و روم کے عیسائی غلبہ جو کہ مشرقی ممالک یعنی شام سے جنوبی افریقہ اور اسپین تک احاطہ کیے ہوئے تھا'

سے آزاد کرالیا۔ یہ علاقے کم وبیش ایک ہزار سال تک یونان وروم کی حکمرانی میں رہے۔
اس دور کا آغاز اس وقت سے ہوا جب اسکندر اعظم نے ایرانی مملکت کو فتح کیا اور رومیوں نے کارتھیج کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ بعد ازاں گیارھویں اور سولھویں صدی کے دوران مسلمان سارے ہندوستان کو درجہ بدرجہ فتح کرنے کے لیے نکلے اور ان کا مذہب بڑے پرامن طریقے سے دور دور تک پھیل گیا جس کی روشنی مشرق میں انڈونیشیا اور چین تک اور جنوب مغرب میں افریقہ تک پہنچ گئی۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں روس بھی ازمنہ وسطی کے آخر میں تھوڑی مدت کے لیے تاتاریوں کے تسلط میں رہا جو اس وقت تک حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے اور مشرقی روایت پسند عیسائی مملکت کے باقی ماندہ حصوں یعنی ایشیائے صغیر اور جنوب مشرقی یورپ کو مسلمان عثمانی ترکوں نے چودھویں اور پندرھویں صدی میں فتح کرلیا۔ ۱۶۸۲ء تک ترکوں نے وی آنا کا دوسری مرتبہ محاصرہ کیا اور اگرچہ اس محاصرے کی ناکامی نے حالات کا دھارا جارح عثمانی مملکت کے مقابلے میں مغرب کے حق میں موڑ دیا تھا تاہم پرچم ستارہ و ہلال اٹلی کے عقب میں عدن کی مشرقی بندرگاہ پر ۱۹۱۲ء تک لہراتا ہوا دکھائی دیتا رہا۔

تاریخ اسلام کے ابتدائی ادوار میں مسلمانوں کی عظیم الشان عسکری اور سیاسی کامیابیاں اور کامرانیاں اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ ترکوں اور دوسرے مسلمانوں نے مغرب سے اپنی سلامتی و بقا کے لیے پیٹر اعظم کے مسلک کی پیروی میں سست روی کا مظاہرہ کیوں کیا جو کہ مغربی طور طریقوں' ہتھکنڈوں' اداروں اور خیالات کو اختیار کرنے پر مبنی تھا۔

پیٹر اعظم نے روس میں صنعتی مغربیت کو رواج اس وقت دیا جب روس کو پولینڈ کے مغربی حملہ آوروں کے ماسکو پر ۱۹۱۰ء-۱۹۱۲ء میں قابض ہوجانے کے تجربے سے گزرے ہوئے ایک سو سال ہو گئے تھے دوسری طرف ۱۶۸۳ء میں وی آنا کے مقام پر ترکوں کی تباہی و بربادی کو ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا کہ جب ایک ترک سلطان نے ترک پیدل فوج کو مغربی طرز تربیت دینے کی طرف پہلا قدم اٹھایا جس کے ۲۳۶ سال بعد ایک

ترک حکمران نے اپنے ملک کے لوگوں کو دل و جان سے مغربی طرز زندگی اختیار کرنے کا واضح حکم صادر فرمایا۔

سلطان سلیم سوم جو کہ ۱۷۸۹ء میں تخت نشین ہوا' اس کی رائج کردہ عسکری اصلاحات کو ۷۴-۱۷۶۸ء کی روس و ترکی عظیم جنگ میں روس کے ہاتھوں ترکی کی شکست کے صدمہ نے جلا بخشی۔ اس وقت تک ترکوں کا خیال یہ تھا کہ روسی ان کے مشرقی راسخ العقیدہ عیسائی یونانی و بلغاری غلاموں کے بھائی ہیں۔ اور اب ترکوں کو ان دہقانی روسیوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست ہوئی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ روسی اس وقت تک مغربی عسکری تکنیک میں مہارت تامہ حاصل کر چکے تھے۔ جہاں تک کھلم کھلا ''تحریک مغربیت'' کا تعلق ہے جو کہ ۱۹۱۹ء میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے چلائی' یہ امر شک وشبہ سے بالا نہیں کہ آیا کمال اتاترک کی گہری بصیرت اور راہنمائی کا خداداد ملکہ بھی ترکوں کو صدیوں پرانے رجعت پسندانہ خیالات کے تاریک غار سے نکالنے میں کامیاب ہوتا اگر پہلی جنگ عظیم کے بعد ترک خود کو اس حالت میں گھرا ہوا نہ پاتے کہ یا تو پورے طور پر مغربی بود و باش کو اپنالیں یا ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ۱۶۸۳ء میں وی آنا کے مقام پر ترکوں کی ناکامی کے بعد دنیائے اسلام پر مغرب کا جوابی حملہ جلد یا بدیر متوقع تھا۔ اس حملے میں تاخیر کی وجہ محض ترکوں اور دوسرے مسلمانوں کی تاریخی عسکری داد شجاعت کی وہ طویل داستانیں تھیں جن کی دھاک ابھی تک اہل مغرب کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں مشرقی روایت پسند مسیحی مملکت میں ترکوں کی فتوحات اور مغربی دنیا کی پسپائی سے اہل مغرب نے یہ سبق سیکھا کہ انہیں اب عالم اسلام پر ناکام و نامراد صلیبی جنگوں کے طرز پر حملہ آور نہیں ہونا چاہیے بلکہ سمندر کو پہلے فتح کر کے عالم اسلام کو گھیرے میں لے لینا چاہیے۔ افریقہ کے گرد سمندر کے راستے چکر کاٹتے ہوئے پرتگالی اہل مغرب مغلوں کے دور سے کچھ عرصہ پیشتر ہندوستان کے مغربی ساحل پر آ نکلے۔ یہ مغل ہندوستان پر مسلمان حملہ آوروں کی

آخری لہر تھے جو کہ مرکزی ایشیا میں بڑی راستوں سے داخل ہوئے۔ ہسپانیہ کے بحر اوقیانوس اور بحرالکاہل کو میکسیکو کے راستے عبور کرنے سے جزائر فلپائن میں مغربی مسیحی مملکت اور اسلام کے درمیان ایک نئی مشرقی ایشیائی سرحد کھل گئی جو کہ اس وقت تک وادی ڈاینوب اور بحیرۂ روم کے مغرب میں ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ بلاشبہ سولھویں صدی کے اختتام سے قبل مغرب سمندر کی تسخیر کے باعث اسلام کے گلے میں پھندا ڈالنے میں کامیاب ہوگیا مگر انیسویں صدی سے قبل مغرب اس پھندے کو پوری طرح تنگ کرنے کی جسارت نہ کرسکا۔ اس وقت تک پہلے مسلمانوں کی عسکری شجاعت کی دیرپا داستانیں ہر دو اطراف قائم و دائم تھیں جن کی وجہ سے اہل مغرب انتہائی محتاط رہے اور در پردہ تیاریوں میں مصروف رہے جب کہ مسلمان اپنی عظمت رفتہ کے نشے میں چور آرام طلب بن کر بے خبری کا شکار ہوگئے۔

جس تجربے نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کی آرام طلبی کے فسوں کو توڑا وہ سلطنت عثمانیہ اور دوسری مسلمان قوتوں کی اپنے مخالفین کے ہاتھوں پے در پے عسکری شکستیں تھیں جو مغربی طور طریقوں صنعتوں اور سائنس سے آراستہ تھے۔ یہی جدید مغربی فن حرب کے بہترین ذرائع وسائل ہیں۔ اس تجربہ کے بارے میں مسلمانوں کا ردعمل وہی تھا جو کہ روسیوں کا تھا۔ ۱۶۹۹ء تا ۱۸۲۵ء روس میں اور اسی طرح ۱۷۸۹ء سے ۱۹۱۹ء تک ترکی میں مثالی انقلابی مغربی طرز حرب اختیار کرنے والا بری یا بحری فوج کا نوجوان افسر تھا۔ لیکن مغربی اذہان کے لیے یہ امر باعث حیرت ہے کیونکہ مغربی مما لک میں ایسے پیشہ ور فوجی دستے جن کو جنگی خدمات تفویض کی جاتی ہیں' کے بارے میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ قدامت پسندی کا مضبوط قلعہ ثابت ہوں نہ کہ انقلاب کے پرجوش حامی ہوں۔ تاہم یہ حقائق مسلمہ ہیں۔ روس میں مغرب زدہ زار پیٹر اعظم کے انقلابی لائحہ عمل کو نافذ کرنے والے اس کے مؤثر عمال یہی نوجوان محافظ فوجی افسر ہی تھے۔ پیٹر اعظم کے عہد کے سو سال سے زائد عرصہ بعد ۱۸۲۵ء میں قدامت پسند زار نکولس اول کے خلاف ناکام انقلاب کا لائحہ

عمل تیار کرنے والے بھی فوجی افسران ہی تھے جو کہ ۱۸۱۴ء میں فرانس پر قابض بین الاقوامی فوج میں خدمات سرانجام دے رہے تھے اور جو وہیں پر مغربی سیاسی خیالات کا شکار ہوئے۔

انیسویں صدی میں روسی انقلابی راہنما کی مثالی طرز زندگی یہ تھی کہ وہ کسی کھاتے پیتے زمیندار گھرانے میں پیدا ہو' فوجی یا دیوانی ملازمت اختیار کرے۔ ادبی رسائل میں فلسفیانہ مضامین لکھے' شاہی خدمت سے جلد فارغ ہو جائے اور اپنی زندگی کا باقی ماندہ حصہ فکر معاش سے آزاد ہو کر روس میں مغربی نہج پر سیاسی اور معاشرتی اصلاح کرنے میں گزار دے۔ یہی طرز زندگی داستان ترکیہ کی روح رواں تھی۔ ترکی میں مغربیت کا ناکام راہ کشا سلطان سلیم سوم اور مغربی طرز زندگی کو رائج کرنے میں محمود دوم اس کا سب سے زیادہ مؤثر جانشین ثابت ہوا۔ دونوں نے مغربیت کا آغاز فوجی دستوں کو مغربی طرز پر تربیت دینے سے کیا۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء کے کامیاب انقلاب ترکیہ کے روح رواں نوجوان فوجی افسران ہی تھے جو کہ روس کے ۱۸۲۵ء کے ناکام انقلاب کے مماثل تھا۔

ترکیہ کے معاملے میں تحریک مغربیت میں نوجوان افسران کی امتیازی حیثیت کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکیہ کا مقصد ۱۸۷۶ء کے مغربی نوعیت کے پارلیمانی دستور ترکیہ کو دوبارہ نافذ کرنا تھا جس کو رجعت پسند سلطان عبدالحمید دوم نے برسر اقتدار آتے ہی فی الفور رد کر دیا تھا۔ عبدالحمید کے تیس سالہ مطلق العنان دور حکومت کی سیاسی حکمت عملی یہ رہی کہ مغربی حریت پسندی کو دوبارہ کبھی ترکی میں سر نہ اٹھانے دیا جائے اور ہر قسم کے ''خطرناک رجحانات'' کی بیخ کنی کر دی جائے۔ اس کے دور حکومت میں کتابوں پر سخت احتساب تھا اور تعلیم پر کڑی نگرانی تھی۔ لیکن عبدالحمید کے باقاعدہ طور پر ظلمت پسند نظام حکومت میں ایک استثنا پیشہ ور جنگی خدمات کے لیے کیڈٹوں کی تعلیم تھی۔ سلطان عبدالحمید مریضانہ حد تک انقلاب سے خوفزدہ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس تھا کہ اگر وہ ترک فوج کے کیڈٹوں کو مغربی عسکری تعلیم سے محروم رکھے گا تو کوئی غیر ملکی طاقت اپنی عسکری اہلیت کی بنا پر ترکی کو فتح کر کے اسے اقتدار سے محروم کر دے گی۔

سلطان عبدالحمید نے اس بات کی بے حد کوشش کی کہ ترک کیڈٹوں کی مغربی تعلیم کو صرف پیشہ ورانہ حدود تک محدود رکھا جائے۔ تاہم جب ان ترک کیڈٹوں کو مغربی عسکری نصابی کتب کا مطالعہ کرنے کے لیے مغربی زبانیں سیکھنے کی اجازت دے دی گئی تو پھر ان کے اذہان کو مغربی سیاسی خیالات سے پاک رکھنا ناممکن ثابت ہوا۔ چنانچہ سلطان عبدالحمید کے دور حکومت میں فوجی کیڈٹ ترکی کی وہ واحد جماعت تھی جس کا ذہنی دریچہ مغربی اثرات کے حصول کے لیے کھلا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ۱۹۰۸ء میں تیس سالہ ظلمت پسند اور جابرانہ دور حکومت کے بعد جب ترکی پر ایک مرتبہ پھر مغربی حریت پسندی کا حملہ ہوا تو اس کا ہراول دستہ فوجی تربیت گاہوں میں تربیت پانے والے نوجوان افسران پر مشتمل تھا۔

ترک فوج کو مغربی انداز پر تیار کرنے کی ضرورت کو سلطان عبدالحمید دوم جیسے انتہائی رجعت پسند بادشاہ نے بھی تسلیم کیا بلکہ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اس جابرانہ دور حکومت سے سو سال پہلے ہی سلطان عبدالحمید کے بدقسمت آزاد خیال پیشرو سلطان سلیم سوم کو بھی اس کا شدید احساس تھا تاہم داستان کے اس پہلے باب میں مغربیت کے قائل ترک بھی اپنے دل میں اس خارجی مغربی تہذیب کے لیے کوئی محبت نہ رکھتے تھے جس کو وہ عمداً رائج کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ مغربی ثقافت کی صرف اتنی خوراک ہی استعمال میں لائی جائے جو کہ یورپ کے مرد بیمار کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہو۔ اور اس بے دلانہ کیفیت نے مغربی اصلاحات کو قسط وار قبول کرنا شروع کیا۔ جس کے نتیجہ میں ترکی تہذیبی سقوط کا شکار ہو گیا۔ ترکی کے ان مغربیت پسندوں کے قدیم مکتب فکر کے بارے میں تاریخ کا فیصلہ کچھ یوں ہے "ہر مرتبہ بہت کم اور بہت دیر ہیں"۔ ان کو امید تھی کہ ترک سپاہیوں کو مغربی وردیوں میں ملبوس کرنے' ان کو مغربی ہتھیاروں سے مسلح کرنے اور ترک افسران کو مغربی پیشہ ورانہ تربیت دینے سے وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ آسٹریا جیسی مغربی طاقتوں اور روس جیسی مغربیت پسند قوتوں کے ساتھ جنگوں میں اپنے ملک کی حفاظت کر سکیں۔ مگر وہ باقی ماندہ ترک طرز زندگی کو اسلام کی روایاتی بنیادوں پر استوار رکھنا چاہتے تھے۔ اب دیکھنا یہ

ہے کہ آخر وہ کیا وجہ تھی جس کی بنا پر مغربیت کو قلیل ترین مقدار میں رائج کرنے کا مسلک ناکام ہو کر رہ گیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس مسلک کو ناکام ہونا ہی تھا کیونکہ ترکی کے فوجی مصلحین اس حقیقت سے مکمل طور پر آنکھیں بند کیے ہوئے تھے جس کا ادراک پیٹر اعظم نے اپنی خداداد بصیرت سے کرلیا تھا کہ کوئی بھی تہذیب یا نظام زندگی ایک ناقابل تقسیم کل حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی تمام جزئیات باہم ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور اس کی تمام اکائیوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔

مثال کے طور پر سترھویں صدی سے مغرب کی سارے عالم پر فن حرب میں برتری کا راز محض مغربی اسلحہ' فوجی قواعد اور فوجی تربیت میں تلاش کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اور نہ اس کو دیوانی صنعتوں میں ڈھونڈنا چاہیے جو کہ فوجی ساز و سامان مہیا کرتی ہیں۔ ہم اس راز سے اس وقت تک آشنا نہیں ہو سکتے جب تک مغربی ذہن اور روح کو مکمل طور پر سمجھ نہ لیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ مغربی فن حرب ہمیشہ سے پہلو دار مغربی طرز زندگی کا ایک پہلو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک خارجی معاشرہ جو مغربی فن حرب کو مغربی طرز زندگی اپنائے بغیر سیکھنے کی کوشش کرے گا لازماً اس فن میں مہارت تامہ حاصل کرنے میں ناکام ہو جائے گا۔ اس کے برعکس کوئی بھی روسی' ترکی غیر مغربی فوجی افسر صرف اس وقت ہی اپنے پیشے میں مغرب کے عام معیار کے مطابق کامیابی حاصل کرسکتا ہے جب کہ وہ مغربی تہذیب کو اس مقدار سے زیادہ اپنائے جتنی کہ وہ نصابی کتب یا فوجی مظاہرہ کے میدان سے سیکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی تقلید کے مدتوں پرانے مسئلے کا جو یہ حل ڈھونڈا گیا کہ ترکی کو مغربی تہذیب محدود پیمانے پر اختیار کرنی چاہیے' اس مسئلہ کا کوئی مناسب حل نہیں تھا۔ تاہم اس مسئلے کے دو ہی قابل عمل حل تھے' ایک تو یہ کہ ترکی کو مغربی تہذیب کو محدود پیمانے پر اپنانے کی غلطی کا خمیازہ اس طور پر بھگتنا چاہیے کہ وہ مغربی تہذیب کے بارے میں اپنے نیم دلانہ رویہ کو جاری رکھے اور اپنے آپ کو مکمل تباہی اور بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کرے۔ یا پھر یہ کہ تباہی سے بچنے کے لیے مغربی تہذیب کو پورے دل و دماغ اور روح و

قوت کے ساتھ قبول کرے۔ اہل ترکی متذکرہ بالا دو رویوں میں سے اول الذکر کو اکتا یہ کر کے تباہی کے کنارے پر جا پہنچے تاہم قبل اس کے کہ وہ مکمل طور پر تباہی سے دوچار ہوتے انہوں نے مصطفیٰ کمال اتاترک کی راہنمائی میں مغربی تہذیب کو لامحدود طور پر اپنا کر اپنے آپ کو بچالیا۔

مصطفیٰ کمال اتاترک نوجوان افسروں میں سے ایک تھا جنہوں نے سلطان عبدالحمید کے عہد حکومت کے آخری دنوں میں پیشہ ورانہ مغربی تعلیم حاصل کرنے کے عمل میں مغربی خیالات کو قبول کرلیا تھا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے ۱۹۰۸ء کے انقلاب میں فعال کردار ادا کیا۔ مصطفیٰ کمال کو اس وقت موقع ہاتھ آیا جب ترکی پہلی جنگ عظیم میں اپنے حلیف جرمنی کی شکست کے نتائج بھگتتے ہوئے دور انحطاط سے گزر رہا تھا۔ مصطفیٰ کمال اچھی طرح جانتا تھا کہ مغربی تہذیب کو ادھورے طور پر اپنانا ترکی کے لیے ہمیشہ مصیبت خیز رہا ہے اور اب بھی اس کو جاری رکھنا مہلک ثابت ہوگا۔ کمال اتاترک ایسی بارعب شخصیت کا مالک تھا کہ وہ اپنے ملک کے لوگوں کو اپنی قیادت میں چلا سکتا تھا۔

مصطفیٰ کمال کا مسلک یہ تھا کہ ترکی جتنی جلدی ممکن ہو مغربی طرز حیات کو اپنا لے۔ ۱۹۲۰ء میں مصطفیٰ کمال نے ترکی کو جس انقلابی لائحہ عمل سے روشناس کرایا وہ شاید ہی کسی ملک میں اتنے قلیل عرصہ میں اس قدر سوچ سمجھ کر اور منظم طریقے سے چلایا گیا ہو۔ اس کی مثال ہماری مغربی دنیا میں تحریک احیائے علوم سولہویں صدی کی تحریک اصلاح مذہب (جس کے نتیجہ میں پروٹسٹنٹ فرقہ معرض وجود میں آیا) سترھویں صدی کے آخر میں برپا ہونے والے لادینی' سائنسی اور فکری انقلاب' انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب میں ملتی ہے۔ ترکی میں جو انقلاب برپا ہوا اس میں ان تمام انقلابات کی روح کارفرما تھی۔ اور یہ ہمہ پہلو انقلاب نہ صرف ایک شخص کی زندگی میں برپا ہوگیا بلکہ اس کو قبول کرنا لوگوں پر قانونی طور پر لازمی قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء کی درمیانی مدت کے دوران ترکی میں کئی ایک اہم تبدیلیاں لائی گئیں جن میں آزادی نسواں' مذہب اسلام کا عدم استحکام اور ترکی زبان

کے لیے عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کا اجراء وغیرہ شامل ہیں۔

اس انقلاب کو ایک ایسے آمر نے برپا کیا جو کہ حزب واحد (Single Party) کے ذریعے ملک کا نظم ونسق چلا رہا تھا۔ اس ایک جماعت کو طاقت کا اجارہ حاصل تھا۔ اور شاید اتنی سرعت سے اس قدر وسیع تبدیلیاں ایسے بھرپور اقتدار کے بغیر ممکن ہی نہ ہوسکتیں۔ ۱۹۲۰ء میں ترکی کے لیے صرف دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ ایک تو یہ کہ اپنی ملکی زندگی کو مکمل طور پر بدل دے یا پھر ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ تاہم ترکوں نے ہر قیمت پر زندہ رہنے کا عزم کرلیا۔ زندہ رہنے کی ایک قیمت تو اہل ترکی کو ایک عرصے تک کمیونسٹ طرز کی فسطائی نازی حکومت کے سامنے سرتسلیم خم کرکے ادا کرنا پڑی۔ اگرچہ ترکی میں ایک حزبی حکومت کا آمرانہ ادارہ کبھی بھی کلیت پسندانہ انتہا کو نہیں پہنچا۔ تاہم نتائج کافی دل خوش کن اور امید افزا تھے۔

۱۹۵۰ء کے عام انتخابات میں ترکی میں کسی تشدد اور خونریزی کے بغیر حزب واحد کی جگہ دو جماعتی نظام حکومت رائج ہوگیا وہ جماعت جس کو طویل عرصے تک حکومت کرنے کا اجارہ حاصل رہا اس نے رائے دہندگان کی مرضی کے سامنے سرتسلیم خم کردیا' اول یہ کہ رائے کے آزادانہ استعمال کا حق دے دیا گیا اور دوم مخالف رائے اس امر کی طرف ایک اشارہ تھا کہ اب برسر اقتدار جماعت کو حکومت سے دستبردار ہوجانا چاہیے اور یہ کہ حکومت حزب اختلاف کو تفویض کردینی چاہیے اور دوسری طرف حزب اختلاف نے بھی اسی دستوری جذبہ کا مظاہرہ کیا۔ جب وہ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اپنے مخالفین کے خلاف انتقامانہ اقدام اٹھا کر اپنے اختیار کا غلط استعمال نہ کیا کہ جنہوں نے آزادانہ انتخاب کے نتائج کا احترام کیا۔ اس طرح کہ انتخاب میں جیتنے والوں کے لیے رضاکارانہ طور پر راستہ ہموار کردیا۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ترکی کے سیاست دان کئی پشتوں تک اس امر کے لیے کوشاں رہے کہ مغربی تہذیب کو اپنائے بغیر کسی طرح صرف مغربی فن حرب کو اختیار کرلیں۔ تاہم اب ترکی میں پارلیمانی دستوری حکومت کا مغربی ادارہ جو کہ فن حرب سے زیادہ مغربی تہذیب کے نزدیک

ہے' پوری طرح جڑ پکڑ چکا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ دیانتداری اور سیاست میں اعتدال پسندی کی نمایاں فتح ہے۔ ہم اہل مغرب کا ایمان ہے کہ آج تک مغرب نے دنیا کو جو تحائف دیے ہیں' ان میں سے ایک بہترین تحفہ پارلیمانی طرز حکومت ہے ہم ۱۹۱۷ء سے کئی جزوی یا برائے نام جمہوری حکومتوں کو دیکھ رہے ہیں جو کہ جابرانہ حکومتوں میں تبدیل ہو کر رہ گئیں اور ان میں سے کئی ایک حکومتیں مثلاً اٹلی اور جرمنی ہماری مغربی تہذیب کی تو معتقد نہیں تھیں بلکہ یہ ہمارے مغربی خاندان کے خلفی ارکان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ۱۹۵۰ء کے ترکی کے انتخابات میں مغربی دستوری روح کی فتح ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور شاید یہ روح سارے عالم میں ایک نئی سیاسی بیداری پیدا کر دے گی۔

بلاشبہ کئی دوسرے مغربی تصورات اور ادارے ہیں جن کی برکات مشکوک ہیں اور ان میں سے ایک مغربی قوم پرستی ہے۔ ترک اور کئی دوسری مسلمان قوموں نے قوم پرستی کے اس نظریہ سے اتنا ہی شدید اثر قبول کیا جتنا کہ دوسرے مغربی نظریات' مفادات اور تباہ کن اثرات سے لیا۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ مغرب کے اس تنگ دلانہ سیاسی نصب العین کے اسلامی دنیا میں راہ پانے کے لیے کیا نتائج برآمد ہوں گے جب کہ اسلام کی اسلامی روایت یہ ہے کہ تمام مسلمان اپنے مشترک مذہب کے ناطے سے بلا امتیاز نسل' زبان اور وطن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

آج دنیا میں مغربی صنعتوں کی ترقی سے فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ آج مغربی طرز زندگی بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے روسی طرز زندگی کے مقابلہ میں سرگرم عمل ہے۔ آج زمانے کی اس معاشرتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسلام کا روایتی انسانی بھائی چارہ ایک بہترین نصب العین معلوم ہوتا ہے۔ اس معاشرتی ضرورت سے عہدہ برا ہونے کے لیے مقتدر خودمختاری کی مغربی روایت جس میں کہ درجنوں علیحدہ قومیتوں کی آزادانہ خودمختاری کو تسلیم کیا جاتا ہے ناکافی محسوس ہوتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم سے مغربی جمعیت ایک نئی صورت حال سے دوچار ہے جس میں کہ

مغرب اندرونی طرز پر تقریباً چالیس مقتدر خود مختار قومی ریاستوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ یہ صورت حال انتہائی پریشان کن ہے اور خدشہ ہے کہ یہ ملک کی تقسیم کہیں ملک کے خاتمے پر ہی منتج نہ ہو۔ تاہم دنیا میں مغرب کا وقار ہنوز اتنا بلند ہے کہ وہ قوم پرستی کے اس متعدی عارضے کا علاج کر سکے۔ یہ امید کی جاسکتی ہے کہ عالم اسلام ہر قیمت پر اتحاد کے لیے اپنے روایتی اسلامی جذبہ کی طاقت سے اس مغربی سیاسی عارضہ کو پھیلنے سے روک لے گا۔ آج کے ایٹمی دور میں ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ایک عالمگیر سیاسی اور معاشرتی اتحاد کی ضرورت ہے جس کو ماضی میں کبھی اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا گیا۔

ترک قوم نے اتاترک کی راہنمائی میں بلاشرط جدید مغربی طرز زندگی کو اس کے نظریہ قوم پرستی سمیت مکمل طور پر اپنا کر یقیناً دنیائے اسلام کی ایک عظیم خدمت سرانجام دی ہے اور ایک مشترک مغربی سوال کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔ لیکن دوسرے اسلامی ممالک کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ بعینہٖ وہی راستہ اختیار کریں جسے ترک راہ کشاؤں نے جذبات کی حرارت میں اپنا لیا تھا۔

مثال کے طور پر عربی زبان بولنے والے مسلم ممالک ہیں' جن میں ایک مشترک زبان مختلف لہجوں میں بولی جاتی ہے۔ لیکن مراکش کے ساحل بحر اوقیانوس سے ایران کے مغربی سرحدوں تک اور شمال میں اپس اور موصل سے خرطوم اور عدن تک اور جنوب میں مسقط اور زنجبار تک ایک واحد معیاری ادبی زبان کے طور پر لکھی جاتی ہے۔ مصر' دمشق اور بیروت میں چھپنے والی کتب اور اخبارات اس وسیع عربی خواں علاقے میں اور اس سے باہر پڑھے جاتے ہیں کیونکہ ایسے اسلامی ممالک میں بھی جہاں یہ روزمرہ کی زبان نہیں ہے عربی کو مذہبی زبان کا درجہ حاصل ہے۔

کیا ایسی دنیا جہاں عربی بول چال مروج ہے' کی تقسیم بھی اس طرح ضروری ہوگئی ہے جیسا کہ بدقسمتی سے امریکہ میں قدیم ہسپانوی مملکت تقریباً بیس خود مختار قومی ریاستوں میں منقسم ہوگئی تھی۔ اب یہ ریاستیں مغربی طرز پر مختلف چھوٹے چھوٹے خانوں میں بٹ کر

زندگی گزار رہی ہیں۔' یہ ہماری مغربی تہذیب کا ایک تاریک پہلو ہے تاہم اگر عالم عرب اس کی ہو بہو پیروی کرے گا تو یقیناً ان کی حالت بھی قابل رحم ہوگی۔

پھر اسلامی دنیا کے تمام کناروں پر افریقہ' ہندوستان اور چین اور سوویٹ روس میں غیر مسلم اکثریتوں کے مابین مسلم اقلیتیں بکھری پڑی ہیں جو کہ کبھی بھی اپنے تمام ارکان کو جغرافیائی بنیادوں پر اکٹھا کر کے ایک مضبوط بلاک کی شکل نہیں دے سکتیں جو اتنی مقتدر خود مختار ریاستوں کو جنم دے سکے۔

یہ منتشر مسلمان جمعیتیں جو کہ کروڑوں افراد پر مشتمل ہیں اپنی نوعیت کی واحد جمعیتیں نہیں ہیں اور اس قسم کی تمام منتشر جمعیتوں کے لیے عقیدہ مغربی قوم پرستی کی فسوں کاری کسی حیات نو کی نوید نہیں بلکہ موت کا پیغام ہے۔

آیئے ہم برصغیر ہندوستان میں منتشر عظیم مسلم جمعیت کی مثال لیں۔ جب ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے ہندوستان سے اپنا بستر گول کیا تو بدقسمتی سے قوم پرستی کی مغربی روح نے خاص مغربی قوم کے ان انسانی نمائندوں کی قائم کردہ اچھی مثال کی تقلید نہ کی جنھوں نے اس مغربی تصور کو ہندوستان میں رائج کیا تھا۔

برطانوی حکمرانوں کے ہندوستان سے کوچ کرنے کے بعد مغربی قوم پرستی ہندوستان میں ہی رہ گئی جس کے نتیجہ میں متحدہ برصغیر دو حریف ریاستوں یعنی ہندوستان اور مسلم پاکستان میں تقسیم ہوگیا اور یہ تقسیم یقیناً دونوں ملکوں کے لیے بدقسمتی اور بدنصیبی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہے۔ موجودہ ہندوستان متحدہ ہندوستان سے کم ہے۔ پاکستان دو حصوں پر مشتمل ہے [1] جن کے درمیان وسیع ہندوستان حائل ہے اور پھر اس تقسیم کے نتیجہ میں کروڑوں ہندو اور ہندوستانی مسلمان نئی سرحدوں کی غلط سمتوں میں رہ رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو اپنے گھروں کو خیرباد کہنا پڑا جب کہ دوسرے ایسی حکومت کے رحم و کرم پر ہیں جو

[1] یہ لیکچر چونکہ ۱۹۵۲ء میں دیا گیا' اس وقت متحدہ پاکستان موجود تھا۔ ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان نے پاکستان کا جغرافیہ تبدیل کر دیا ہے۔

کہ ان سے اچھا سلوک کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔

اب پاکستانیوں کے پاس اپنی ایک الگ قومی ریاست ہے جو کہ وسیع رقبہ اور آبادی پر مشتمل ہے۔ لیکن ان ہندوستانی مسلمانوں کو اس آزاد ریاست کے قیام کے لیے ترکوں سے کہیں زیادہ اور مصریوں سے بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ انہیں تجربے سے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ مغربی قوم پرستی کے لیے کیا بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور یہ کہ اس میں کون کون سی خامیاں ہیں۔ اس لیے پاکستانی اور ترک سیاسی سبق سیکھ رہے ہیں اور یہ اسباق نہ صرف دوسرے اسلامی ممالک کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

ہندوستان اور مغرب

ہندوستان مغرب سے تصادم میں جس انوکھے تجربہ سے دو چار ہوا ہے دنیا کا کوئی اور ملک اس سے آشنا نہیں ہوسکا۔ ہندوستان بذات خود ایک ایسا خطہ ارضی ہے جو کہ اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتا ہے اور اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔ اس کے معاشرے کی ہیئت ترکیبی بھی مغربی معاشرے سے مماثل ہے۔ یہ ایک ایسا غیر مغربی عظیم معاشرہ ہے جسے نہ صرف مغربی ہتھیاروں کی مدد سے تاخت و تاراج کر کے فتح کیا گیا بلکہ بزور قوت اس پر حکمرانی بھی کی گئی۔

بنگال میں مغربی دور حکومت تقریباً دو سو سال تک اور پنجاب میں ایک سو سال سے زیادہ عرصہ تک چلتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب سے اس تصادم میں ہندوستان کا تجربہ چین اور ترکی کے مقابلے زیادہ تلخ اور توہین آمیز ہے۔ بالخصوص روس اور چین کے مقابلے میں تو ہندوستان کا تجربہ اور بھی تکلیف دہ ہے۔ تاہم اس تجربے سے ہندوستان نے مغرب سے بہت کچھ سیکھا۔

اہل ہندوستان اور اہل مغرب کے ذاتی مراسم وسیع اور گہرے تھے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مغربیت ہندوستانیوں کی روح میں رس بس گئی ہے۔

اگر ہندوستان کو پہلے مسلمان فاتحین نے فتح نہ کیا ہوتا تو ممکن ہے وہ مغربی حملہ آوروں سے بھی فتح نہ ہوتا۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں مغل بادشاہ ہندوستان کو بری راستے سے فتح کرنے والے مسلمان فاتحین کی آخری لہر تھے۔ مغل فاتحین ہندوستان میں ۱۴۹۸ء میں مغربی پرتگالی ملاحوں کی پہلی لہر تھی۔ ان مغل بادشاہوں نے سارے ہندوستان کو ایک جھنڈے تلے جمع

کر کے برطانوی حکمرانوں کا کام آسان کر دیا۔

اگرچہ مغل بادشاہوں کے دور حکومت میں بھی ہندوستان میں مکمل امن و امان کا دور دورہ تھا تاہم برطانوی حکومت کے زمانہ عروج میں امن و امان کی حالت مغل دور حکومت سے کہیں بہتر تھی۔ جہاں تک زمانہ امن و امان کی مدت کا تعلق ہے یہ ہر دو ادوار میں یکساں ہے۔

اٹھارویں صدی میں یہ امن کا آبگینہ چکنا چور ہو گیا۔ تاہم مغلوں نے ایسی روایات چھوڑی تھیں کہ جن کی پیروی کر کے مغلوں کے برطانوی جانشینوں نے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی مغل سلطنت کو از سر نو متحد کر دیا۔

مغلوں کی چھوڑی ہوئی ایک میراث ان کا زرعی نظام لگان تھا۔ یہ نظام اٹھارویں صدی میں جب کہ لوگوں کو لاقانونیت کا مرض ہو گیا اپنی تکنیکی خوبیوں کی بناء پر کامیابی سے چلتا رہا۔ اس نظام کے چلنے کی دوسری وجہ ہندوستانیوں کی خوئے تسلیم و رضا تھی۔ ہندوستانیوں کے دل و دماغ کی کیفیت صدیوں کی محکومی سے کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ وہ باہر سے آئے ہوئے فاتحین کی حکومت کی اطاعت کو بغیر کسی ناگواری کے بسر و چشم قبول کر لیتے تھے۔

ہندوستانیوں کی یہی خوئے تسلیم و رضا مغلوں کی دوسری میراث تھی۔ جس سے انگریزوں نے کماحقہ فائدہ اٹھایا۔ ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے انگریز جانشینوں نے اس بات کا خاص اہتمام کیا کہ ہندوستان میں مغل راج کا احیا نہ ہو سکے۔ اسی لیے ۱۸۳۰ء میں انگریزوں نے خوب سوچ سمجھ کر لائحہ عمل تیار کیا کہ ان کے مغل پیشرووں نے جو عادات ہندوستانیوں کے اذہان میں کاشت کی ہیں انہیں کاٹ دیا جائے۔

۱۸۳۰ء میں انگریز حکمرانوں نے ہندوستان کے ہندو اور اسلامی نظام ہائے تعلیم کو انگریزی نظام سے بدل کر ہندوستانی ذہن کی ایک کھڑکی مغرب کی طرف کھول دی اس طرح انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اپنے فلسفہ آزادی' پارلیمانی دستوری حکومت اور قوم پرستی کے نظریات سے روشناس کرایا۔ ہندوستانیوں نے مغرب کی سیاسی تعلیمات کو دل میں

جگہ دی۔ ان تعلیمات نے انہیں ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ اٹھانے کی تحریک دی اور آخر کار انگریزوں کو ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ منظور کر کے حکومت سے دست بردار ہونا پڑا اور آج بھارت میں انگریزوں کے ہندو اور پاکستان میں مسلمان جانشینوں نے برصغیر کے اپنے اپنے حصے پرانے خطوط کے مطابق حکمرانی کرنے کے کار عظیم کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ برصغیر کے بڑے حصے کے موجودہ ہندو حکمرانوں کو اپنی حکومت بالکل انہی مغربی بنیادوں پر چلانی چاہیے تھی (اور جیسا کہ انہوں نے چلائی) جو مغرب کے بیرونی فاتحین نے وہاں اٹھائی تھیں۔

وہ علاقے جو اب متحدہ ہندوستان میں شامل ہیں ہندوؤں کا آبائی وطن ہیں۔ تاہم ہندو اپنے وطن میں مسلمانوں کے نو سو سالہ دور اقتدار کے بعد پہلی مرتبہ حاکم بنے ہیں۔ اس وقت کچھ عرصے تک ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مغلوں کے فوراً بعد ہندوستان میں ان کی جگہ ہندو ریاستیں قائم ہو جائیں گی۔ اٹھارویں صدی میں مغلوں کی جگہ لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے والوں میں سے ہندو مرہٹوں کی طاقت کے بارے میں یہ گمان اغلب تھا کہ وہ مال غنیمت کا بڑا حصہ لے جائے گی۔

اٹھارویں صدی میں مغل راج کو ہندو مرہٹہ راج سے بدلنے کے منصوبے کو ایک اور مضبوط مغربی طاقت نے خاک میں ملا دیا اور ہندوستان میں مرہٹہ راج قائم ہونے کے بجائے برطانوی راج قائم ہو گیا۔ اس تبدیلی کے باوجود ہندوؤں کا ہندوستان میں از سر نو ہندو راج قائم کرنے کا منصوبہ ختم نہ ہوا۔ اٹھارویں صدی میں ہندو راج کے احیا کے لیے ہندوؤں نے فوجی راستہ اختیار کیا۔ لیکن یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ تاہم اس موقعہ پر ہندوؤں کی یکجا قوت کی ندی مختلف نالوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہندوؤں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے برطانوی راج میں اقتدار حاصل کرنے کی کوشش آہستہ آہستہ جاری رکھیں۔ تاہم برطانوی راج میں انہیں اقتدار حاصل ہو گیا۔ یہ اقتدار انہیں ہتھیاروں کی طاقت سے نہیں

بلکہ مغربی نظام تعلیم' امور حکومت اور قانون پر عبور حاصل کرنے سے ہوا۔ اور مغربیت کے راستے پر چلنے والے ایک ملک کے لیے یہی چیزیں طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ تاریخ ہند کے مغربی دور میں ہندو موقعہ شناسی میں مسلمانوں سے بہت زیادہ تیز نکلے۔ مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں کے ہاں اقتدار اور شان و شوکت کے چھن جانے کا کوئی احساس نہ پایا جاتا تھا۔ جو انہیں مرحوم ماضی کے خیالات میں مگن رکھتا اور مستقبل سے بے نیاز کر دیتا۔ یقیناً یہ احساس محرومی ہمتوں کو پست کر دیتا۔ اور اسی لیے طاقت کا وہ توازن کہ جس کا جھکاؤ اٹھارویں صدی کے نزاعی دور میں مسلمانوں کے خلاف تھا' انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی مسلمانوں کے خلاف رہا۔

ہندوؤں اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان مقابلے میں آگے بڑھنے کی اہلیت تاج برطانیہ کے نزدیک (کہ جس کی وہ یکساں رعایا تھے) ذہنی قابلیت تھی نہ کہ عسکری طاقت۔ ہندوستانی مسلمانوں نے بھی آخر کار ہندوؤں کی قائم کردہ مثال کی پیروی کی۔ اور پھر انہوں نے بھی ہماری مغربی تہذیب کے طور طریقے اختیار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کے باوجود جب انگریزوں نے رضا کارانہ طور پر ہندوستان سے اپنا بوریا بستر سمیٹنے کا فیصلہ کیا تو ہندوستانی مسلمانوں نے پرزور مطالبہ کیا کہ اقتدار کی منتقلی تقسیم کے اصول پر ہونی چاہیے۔ اور اقتدار ریاستوں یعنی ایک ہندو ریاست اور دوسری مسلم ریاست کو ملنا چاہیے۔ تقسیم کا یہ پرزور مطالبہ اصل میں اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ ہندوستان میں عظیم مغلوں کے دور سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان طاقت کا توازن مسلمانوں کے خلاف رہا ہے۔ سارے برصغیر پر مشتمل ایک متحدہ ہندو مسلم مملکت کے بارے میں مسلمانوں کو یہ اندیشہ تھا کہ ہندوؤں کی اکثریت میں ان کی علیحدہ حیثیت گم ہو کر رہ جائے گی۔ اگرچہ ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے غلبہ سے آزاد ہو کر مسلم پاکستان اور ہندو یونین دو الگ الگ ملکوں کی حیثیت سے ابھرے تاہم برطانوی حکومت کی دونوں جانشین ریاستوں کا مقصد ابھی تک ایک ہی ہے۔ ان کی تواریخ کے پہلے باب میں دونوں ریاستوں میں طاقت آبادی کے اس عنصر کے

ہاتھوں میں ہے جس نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور وہ مغربی آئیڈیل سے متاثر ہیں۔ اگر یہی عنصر ہندوستان، پاکستان اور سیلون میں برسر اقتدار رہا تو ہم یہ خوشگوار امید کر سکتے ہیں کہ ان ایشیائی ملکوں کے سیاست دان اپنے ہم وطنوں کو ہماری ''آزاد دنیا'' کا رکن رہنے کی ترغیب دلائیں گے۔ یہ بات بلاشک وشبہ کہی جاسکتی ہے کہ یہ ایشیائی سیاست دان ''آزاد دنیا'' کا مطالبہ جاری رکھیں گے۔

ایسی آزاد دنیا کہ جو اہل مغرب اور اہل ایشیا کا مشترکہ مسکن ہوگا اور وہاں خاندان کے ایشیائی ارکان کے ساتھ کوئی غیر منصفانہ اور ناروا سلوک نہ ہوگا۔ ہم مغربی ارکان کا فرض ہے کہ اگر ہم اپنی دنیا کو آزاد کہنے میں مخلص ہیں تو ہم ایشیائی ارکان کو اس معاملے میں مکمل تحفظ کی ضمانت دیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر ہندو پاک کے باشندے نسل انسانی کے دو ایشیائی حصوں میں ایک ہیں۔ چین کہ جو نسل انسانی کے دو ایشیائی حصوں میں سے دوسرا ہے مصری کیمپ سے نکل کر روسی کیمپ میں چلا گیا۔ اگر ہماری مغربی دنیا برصغیر چین کی دوستی سے محروم ہو جانے کے بعد برصغیر ہند کی دوستی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی یورپ اور افریقہ کے دو مورچوں کے سوا باقی ساری قدیم دنیا (نو آبادیاں) روس کے مقابلے میں ہار دی ہیں۔ اور شاید آزاد دنیا اور کمیونزم کے درمیان حصول طاقت کی حالیہ کشمکش میں اس واقعہ کی حیثیت فیصلہ کن ہوگی۔ برصغیر میں برطانوی حکومت کی جانشین ریاست بھارت ہے کہ جس کے حصے میں برصغیر کا بیشتر علاقہ ہے۔ اس ریاست میں ہندوؤں کا غلبہ ہے۔ آج کی تقسیم شدہ دنیا میں عظیم تر عالمی طاقت بننے کے لیے امریکہ اپنے حواریوں کے ساتھ روس اور اس کے حواریوں سے (دنیا کی عظیم طاقت بننے کے لیے) مقابلہ کر رہا ہے۔ اس مقابلے میں ہندوستان کو بڑی اہم حیثیت حاصل ہے۔

ہندو نسل انسانی کا پانچواں حصہ ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں کا جھکاؤ کدھر ہوتا ہے؟ ایک اندازہ یہ ہے کہ ہندو ہمارے مغربی راستے پر ہی گامزن رہیں گے۔ آیئے ان

امکانات کا جائزہ لیں کہ جو اس اندازے کے حق اور مخالفت میں ہیں۔ (کہ ہندو ہمارے مغربی راستے پر چلتے رہیں گے) آیئے اس جائزے کا آغاز سب سے زیادہ امید افزا بات سے کریں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج ہندوؤں اور انگریزوں کے درمیان جتنے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اتنے اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ برطانیہ کے بہت سارے شہریوں کو یقیناً ہندوؤں کے حد سے بڑھتے ہوئے لطف و کرم سے مسرور و متاثر ہونے کا تجربہ ہوا ہوگا۔ جیسا کہ مصنف کو ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔ یہ تجربہ مصنف کو کئی مرتبہ بیرونی ممالک میں ہوا ہے کہ جہاں کے مقامی مبصر اسی تاڑ میں تھے کہ ہمارے اور ہندوستانیوں کے موجودہ تعلقات کا صحیح صحیح اندازہ لگائیں۔ مصنف نے بیرونی ممالک میں ہندوستانیوں کو بڑے واضح (بلکہ حد سے بڑھے ہوئے) انداز میں یہ ظاہر کرتے ہوئے دیکھا ہے (کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے) ان کے اور انگریزوں کے درمیان جو پرانی ناگوار اجنبیت تھی وہ اب دم توڑ چکی ہے اور دور کہیں زمین کی تہوں میں دفن ہو چکی ہے۔ جب عظیم برطانیہ نے ہندوستان سے اپنی حکمرانی ختم کرنے کا وعدہ سچ کر دکھایا تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کی آنکھیں حیرانی سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہندوستانیوں کو شاید کبھی پوری طرح اس بات کا یقین نہیں آیا تھا کہ انگریز واقعی ہندوستان سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے جب انگریزوں نے اپنے وعدے کا پاس کیا تو ہندوستانیوں کے انگریزوں کے بارے میں دشمنی کے جذبات خوشی سے بدل گئے۔ یہ ہندوستانیوں کی عالی ظرفی ہے کہ انہوں نے برطانیہ کے ساتھ اپنے نئے دوستانہ روابط استوار کیے۔

ہندوستانیوں اور انگریزوں کے آپس کے روابط میں یہ خوش گوار تبدیلی یقیناً ہماری ''آزاد دنیا'' کی قوت میں کچھ نہ کچھ اضافے کا باعث ضرور ہوئی ہے۔

ہندوستان اور مغربی دنیا (ہندوستان کے لیے برطانیہ مغربی دنیا کا نمائندہ تھا) کی کشیدگی ۱۸۹۰ء میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے آغاز سے بلکہ اس سے پہلے ۱۸۵۷ء کے افسوس ناک تصادم سے شروع ہوئی۔ اس کشیدگی کی تاریخ ۱۷۸۰ء میں ہندوستان میں

ہونے والی انتظامیہ کی تبدیلیوں کے زمانے سے جاملتی ہے۔ ہندوستان اور انگریزوں کے روابط میں اصلاح کے نتیجے میں کشیدگی پیدا ہونا تاریخ کی لطیف طنزوں میں سے ایک ہے۔ تاہم ان دونوں واقعات میں ایک داخلی ربط ضرور پایا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں ہندوستان میں نئے نئے قدم جمانے والے انگریز حکمران اپنے نئے محکوموں سے دو وجوہات کی بنا پر ہر طرح کا سلوک کرنے میں آزاد تھے۔ ہندوستانیوں سے مال وزر لوٹنے میں وہ ہر بندش سے آزاد تھے کہ جس طرح چاہیں اپنی سیاسی طاقت کا استعمال کریں اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں سے معاشرتی تعلقات بڑھانے میں انہیں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ انگریز اپنے محکوم ہندوستانیوں کے ساتھ اوقات کار کے علاوہ خوب گھل مل گئے تھے۔ تاہم اوقات کار کے دوران وہ ان کے ساتھ کچھ بے دلی سے ملتے تھے۔

اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں اقامت پذیر علم وادب سے دلچسپی رکھنے والے انگریز اپنے ہندوستانی ساتھیوں کے ساتھ فارسی اشعار پڑھ کر خوب لطف اندوز ہوئے۔ اسی طرح زیادہ زندہ دل ہندوستانیوں نے انگریزی کھیلوں کی طرف اپنی رغبت کا مظاہرہ کیا۔ زرخنی کی تصویر ''لکھنؤ میں کرنل مارڈانٹ کا کاک میچ'' جسے ۱۷۸۶ء میں بنایا گیا ہے۔ اس تصویر کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان دنوں ہندوستانی اور انگریز ایک دوسرے سے خوب گھلے ملے ہوئے تھے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہندوستان کے انگریز حکمرانوں کی پہلی جماعت نے وہی رویہ اختیار کیا جو ان کے پیشرو ہندوؤں اور مسلمانوں نے اختیار کیا تھا۔ ان میں بشری خامیاں پائی جاتی تھیں۔ اس طرح وہ غیر انسانی انداز میں الگ تھلگ نہ رہ سکتے تھے۔ انگریز حکومت کے انگریز مصلحین نے بجا طور پر اس بات کا تہیہ کیا تھا کہ وہ ان اخلاقی برائیوں کا قلع قمع کریں گے اور اس کٹھن مہم میں انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس پروگرام کی کامیابی کے لیے وہ جان بوجھ کر حاکموں اور محکوموں کی بے تکلفی کا بھی خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کو برتاؤ میں اس وقت تک فوق البشری، دیانت داری اور عدل کی ترغیب نہیں دلائی جاسکتی جب تک کہ انہیں یہ

احساس نہ دلایا جائے اور انہیں ایسا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے کہ وہ جھوٹ موٹ کے خدا ہیں جنہیں اونچے اونچے ستونوں پر جلوہ افروز کیا گیا ہے۔ اور وہ نیچے بسنے والی ہندوستانی انسانی مخلوق سے بہت بلند ہیں۔ آج جب کہ ایک مرتبہ پھر ہندوستانی اپنے آپ پر خود حکومت کر رہے ہیں۔ اس لیے اب آئندہ لارڈ کارنوالس کے مسئلے کے ابھرنے کا کوئی سوال نہیں کہ مغربی انتظامیہ کا معیار کیسے بلند کیا جائے؟ اس لیے اب ہندوستانیوں اور انگریزوں کے باہمی روابط میں انداز مروّت اور شائستگی اختیار کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں اور یہ بہتری کی طرف ایک امید افزا تبدیلی ہے۔

یہ لہر جہاں تک بڑھے اچھا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ بھی کہ یہ بڑھتی کہاں تک ہے۔ بایں ہمہ ہندوستان کی ۴۵ کروڑ کی آبادی میں سے صرف چند ہزار کو کبھی کسی مغربی سے ملنے کا موقعہ ملا ہوگا یا آئندہ ملے گا۔ بلکہ انہیں تو اپنے مغرب زدہ حکمرانوں سے بھی ملنے کا کبھی موقعہ نہیں ملا۔ اتنی کثیر آبادی میں سے صرف چند ہزار ہی ہندوستانیوں کی مغرب زدہ اقلیت کے کسی رکن سے جواب اپنے سے پہلے مغربی حکمرانوں کی جگہ حکومت کر رہے ہیں' سے ملاقات ہوئی ہوگی یا اب آئندہ بھی ہوگی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کی اس حکمران جماعت کا مستقبل کیا ہے؟ کیا یہ جماعت اپنی موجودہ حکمرانی برقرار رکھنے میں کامیاب رہے گی اور کیا مغربی تصورات اور نصب العین جو اس اقلیت کی روحوں پر مغربی تعلیم کے بل بوتے پر نقش کر دیے گئے ہیں' پنپ سکیں گے؟ اور کیا یہ اقلیت اپنی ہندو روایات سے متصادم ان مغربی تصورات اور نصب العین کا تحفظ کرنے میں کامیاب ہو جائے گی کہ جن تصورات کا سکہ ان کی روحوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس نصب العین کی جڑیں ان کے دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ زندگی کے بارے میں مغربی اور ہندو نقطہ نظر میں کتنا بعد ہے' اس بات کی داد دینا پڑتی ہے کہ ہندوستان کی حکمران اقلیت نے مغربی نصب العین اور تصورات کو جس حد تک اپنایا ہے' ہندوؤں کی عظیم اکثریت کی ایک انتہائی مختصر اقلیت کے لیے انتہائی مشکل

تھا۔

پہلے دو ابواب میں ہمارا تعلق مغرب کے ساتھ روس اور اسلام کے روابط سے تھا' وہاں ہم دو ایسے معاملات کا ذکر کر رہے تھے کہ جن میں مغرب جس بھی غیر مغربی پارٹی سے ٹکرایا وہ مغرب کے ساتھ کوئی نہ کوئی قدر مشترک رکھتی تھی لیکن ہندوازم مغرب کے ساتھ ایسی کوئی مشترک قدر نہیں رکھتا۔

ہمارے ہم عصر روسی' مغربی عیسائیوں کی اولاد نہیں ہیں بلکہ مشرقی روایت پرست عیسائیوں کی اولاد ہیں تاہم عیسائی مذہب اور یونانی و رومی تہذیب دونوں کو مسیحی چرچ نے اختیار کیا' برقرار رکھا اور ہمارے حوالے کیا۔ ہماری طرح یہ مسیحی مذہب اور یونانی و رومی تہذیب دونوں روس کے روحانی پس منظر کا اس طرح حصہ ہیں جیسے ہمارے ہیں۔ ہمارے مسلمان ہم عصر ایک ایسے مذہب کے وارث ہیں جسے کمیونزم کی طرح عیسائیت کی بدعت کہا جا سکتا ہے اور یونانی فلسفہ اور سائنس ہماری طرح مسلمانوں کے روحانی پس منظر کا اسی طرح حصہ ہیں۔ جیسے ہمارے روحانی پس منظر کا حصہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اپنی ہم عصر دنیا پر ایک مجموعی نگاہ ڈالیں اور دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں کے حساب سے تقسیم کا ایک وسیع اور سادہ تجزیہ کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسلمان اور سابقہ مشرقی روایت پسند عیسائی اور سابقہ مغربی عیسائی سب ایک گروہ میں شامل ہیں اور سب کے سب ایک ہی بڑے معاشرے کے ارکان ہیں۔ اگر ہم اس وسیع معاشرے پر ہندوستانی دنیا اور مشرق بعید کی دنیا کی طرح کوئی ایک لیبل چسپاں کر سکیں تو اس معاشرے کو ہم ان دونوں دنیاؤں سے ممتاز کر سکتے ہیں۔

ہم عیسائیوں اور مسلمانوں کا جو مشترکہ روحانی اثاثہ ہے وہ یہودیوں اور عیسائیوں کا متروکہ ترکہ ہے جسے دونوں قوموں نے اپنا لیا ہے۔ یہ اثاثہ ہمیں دو مشترکہ ترکوں سے حاصل ہوا ہے' ایک یہودیوں سے اور دوسرا یونانیوں سے۔ ہم اپنے عیسائی' مسلم معاشرے کو ہندو معاشرہ اور مشرق بعید کی کنفیوشسی' بدھ سوسائٹی سے ممیز کرنے کے لیے یونانی یہودی معاشرہ

کا نام دے سکتے ہیں۔ ساری دنیا کے اس طائرانہ جائزے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے متروکہ یونانی یہودی طرز زندگی کے چھوٹے چھوٹے اختلافات بڑے مدھم دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اختلافات ان صفات کے مقابلے میں بڑے حقیر نظر آتے ہیں جو ہم سب مسلمانوں اور عیسائیوں کے متروکہ ثقافتی خاندان (یونانی' یہودی) میں پائی جاتی ہیں۔

اگر ہم اپنے مشترکہ مسلم' عیسائی طرز زندگی کا ہندو یا مشرق بعید کے طرز زندگی سے مقابلہ کریں تو ہمیں مسلم' عیسائی معاشرے کے وہ سارے اختلافات تقریباً معدوم نظر آئیں گے جو مشرقی روایت پرست مسیحی چرچ اور مغربی مسیحی چرچ یا ان دونوں مسیحی چرچوں اور اسلام میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ نسبتاً چھوٹے ثقافتی اختلافات ہمارے یونانی' یہودی تہذیب کی ان جڑواں بہنوں میں سے ایک کے بچوں کی روحوں میں بہت بڑے فتنے پیدا کر سکتے ہیں اگر ان میں سے ایک تہذیب کو دوسری تہذیب کے بچوں کی روحوں پر روحانی شعاع افشانی کرنے اور ان کی زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک قابل ذکر مثال ان نقوش کی ہے جو روسیوں کی روحوں پر پیٹر اعظم کے زمانے میں مغربی تہذیب سے تصادم کے نتیجے میں ابھر آئے تھے۔ اس تصادم میں حصہ لینے والے دونوں فریق اسی ایک یونانی یہودی خاندان کے رکن تھے لیکن اس کے باوجود روسیوں کی یونانی' یہودی روحوں میں زبردستی گھس آنے والی اس یہودی جو ہر روحانی کی دوسری قسم یعنی مغربی اجنبیت سے زبردست فتنے پیدا ہوئے۔ ہم اس نفسیاتی اضطراب کی شدت کا اندازہ انیسویں صدی کے روسی ادب میں پائے جانے والی رگ اشک بار سے کر سکتے ہیں۔ یہ ادب اس روح کے شدید کرب کا اظہار ہے جو بیک وقت دو مختلف روحانی جہانوں میں بسنے پر مجبور ہو۔ درآنحالیکہ اسی ایک روح سے روحانی اطاعت کے دعویدار ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہوں۔ ہم سیاسی طور پر روسی روحوں پر مغرب کے دباؤ اور بے پناہ بوجھ کی شدت کا اندازہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے دھماکے سے کر سکتے ہیں کہ جس میں یہ روحانی کرب خود اپنے بوجھ سے سبکدوش ہوا۔ روسی روحوں

میں مغرب کے ساتھ تصادم سے جو فتنے پیدا ہوئے وہ بڑی واضح صورتوں میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ وہ شاید ان خوابیدہ فتنوں سے بہت کم ہیں جو اسی مغربی روح سے ہندوستانی روحوں میں پیدا ہوئے تھے۔

اگرچہ روسی روحوں میں اضطراب بڑا تندو تیز تھا تاہم اس کی شدت میں روسی تہذیبی ورثے میں یہودی' یونانی عناصر کی موجودگی کی وجہ سے کچھ کمی ضرور ہوئی ہوگی کیونکہ یہی عناصر حملہ آور مغربی تہذیب کے ورثے میں بھی موجود ہیں۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کے تہذیبی ورثے کا تعلق ہے اس میں کوئی یونانی' یہودی عناصر نہیں پائے جاتے اور نہ ہی وہاں کوئی مغرب سے تصادم کے نتیجے میں پہنچنے والے صدمے کی شدت کو کم کرنے کے لیے ان یونانی' یہودی عناصر تہذیب کی حمایت میں کسی قیمت پر کچھ کہہ سکتا تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں مقامی اور بیرونی روحانی قوتوں کے درمیان جس انتہائی شدید کشاکش کا قیاس کیا جاتا ہے اس کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ ہندوؤں نے ہماری انتہائی اجنبی غیر ملکی تہذیب کو صنعتوں اور سائنس' زبان و ادب' انتظامیہ اور قانون کے میدانوں میں اختیار کیا۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہندو مغربی طرز زندگی کو اپنے مقامی طرز زندگی سے ہم آہنگ کرنے میں روسیوں سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ حالانکہ یہ طرز زندگی ان کے لیے روسیوں کے مقابلے میں زیادہ اجنبی تھا۔ تاہم ہندوؤں کی روحوں میں ہم آہنگی کے اس عمل کی بدولت کرب و اضطراب انتہائی شدید ہوگا اور یقیناً جلد یا بدیر یہ اضطراب میں اپنے روحانی کرب سے چھٹکارا پانے کے لیے خود ہی کوئی راستہ نکال لے گا۔ بہرحال ہندو اس کرب و اضطراب سے نجات پانے کے لیے بالآخر جو بھی ترکیب سوچیں' اتنی بات واضح ہے کہ کمیونزم کے اثر و رسوخ کے لیے اپنا سینہ کھول کر اپنے اس کرب و اضطراب سے نجات نہیں پا سکتے جو مغربی تہذیب کے اثرات سے ان کی روحوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیونزم ایک مغربی بدعت ہے جسے قدیم روایت پرست عیسائی روس نے اپنایا۔ یہ بدعت اسی طرح یونانی' یہودی اور تہذیبی میراث کا حصہ ہے جیسے ہمارا

مغربی طرز زندگی اور یہ ساری کی ساری تہذیبی (ثقافتی) روایت ہندو مزاج کے لیے غیر ملکی اور اجنبی ہے تاہم آج کے ہندوستان کے معاشی اور معاشرتی حالات میں ایک عنصر ایسا ہے کہ جس کی بدولت شاید کمیونزم کو ہندوستان میں اپنے اثر ونفوذ پھیلانے کی راہ ملے اور یہی تخریبی عنصر ہندوستان میں وسائل خوراک پر بڑھتا ہوا عوامی دباؤ ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے کیونکہ یہی عنصر آج کل چین' جاپان' ہند چینی' انڈونیشیا اور مصر میں برسر کار ہے۔ ان تمام غیر مغربی ممالک میں مغربی اثر ونفوذ کی بدولت خوراک کی پیداوار میں تدریجی اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ آبپاشی' نئی فصلوں کی دریافت اور زراعت کے طریقوں میں مغرب کی تحریک جدید سے اصلاحات کی بدولت ہوا۔ اور ان تمام ملکوں میں ابھی تک کسی مرحلے میں خوراک کی بہم رسانی میں اضافے کو جامد آبادی یا تدریجاً بڑھتی ہوئی آبادی کے معیار زندگی کو اونچا کرنے پر استعمال نہیں کیا گیا بلکہ پرانے معیار پر ہی جتنی زیادہ سے زیادہ آبادی کی کفالت ممکن تھی کی گئی ہے اور یہ معیار ''فاقہ زدگی'' سے ذرا ہی بلند تھا۔ اور اب بھی ان ملکوں میں یہی معیار زندگی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بار آوری میں تدریجی اصلاحات جلد یا بدیر مختتم اضافے کے نقطے کو چھولیں گی اور پھر پیداوار میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ اس طرح اس بڑھتی ہوئی آبادی کے معیار زندگی کے گر جانے کا خطرہ بھی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ معیار زندگی کی ذرا سی پستی بھی بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ اس لیے کہ یہ معیار زندگی پہلے ہی قوت لایموت کے درجے پر ہے۔

ایسی ہی کسی خستہ حال معاشی صورتِ حال کی بدولت شاید کمیونزم ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں کھڑے ہونے کی جگہ حاصل کرلے۔ تاہم ان ملکوں کے لیے کمیونزم بھی اتنا ہی اجنبی ہے جتنا کہ ہمارا مغربی طرز زندگی۔ کیونکہ کمیونزم بڑے پیمانے پر جبری اجتماعی ملکیت اور مکانیت کا پروگرام رکھتا ہے جسے وہ ایشیا کے مجبور کسانوں کے سامنے ان کے خراب وخستہ حال کے مسحور کن علاج کے طور پر پیش کرسکتا ہے۔ دریں حالات دکھوں میں گھرے ہوئے ان لوگوں کے لیے یہ نصیحت انتہائی مضحکہ خیز ہوگی کہ وہ اپنے مسائل کو

امریکی طرز پر حل کریں۔

اس مسئلہ آبادی اور روس اور مغرب کے مقابلے میں اس کے تعلق سے ہمارا آمنا سامنا پھر ہوگا جب ہم مشرق بعید کا تذکرہ کریں گے جو کہ ہمارے اگلے باب کا موضوع ہے۔

مشرق بعید اور مغرب

پچھلے باب ہم نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ ہمارا مغربی طرز زندگی ہندوؤں کے لیے روسیوں کے مقابلے میں زیادہ اجنبی ہے کیونکہ ہندو طرز زندگی میں یونانی اور یہودی عناصر کی آمیزش بہت ہی قلیل مقدار میں ہے۔ یہ یونانی و یہودی عناصر تہذیب اسلام روس اور مغرب کی مشترک میراث ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مشرق بعید کے فنون میں یونانی اثر خاص نمایاں ہے۔ لیکن یہ یونانی اثر مشرق بعید میں ہندوستان کے راستے سے پہنچا۔ یہ اثر ایک ہندوستانی مذہب بدھ مت کی وساطت سے مشرق بعید پہنچا اور وہ مشرق بعید کی دنیا پر ایسے ہی چھا گیا جیسے یونانی و رومی دنیا ایک یہودی مذہب عیسائیت کے زیر اثر آ گئی تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک دوسرا مذہب اسلام جو ہندوستان کے کثیر حصے میں فتوحات کے بل بوتے پر پھیلا تھا وہ چین کے مغربی کناروں پر پر امن اثر و نفوذ سے پھیلا۔ اس لیے مشرق بعید کی زود اعتقادی سے ہندوستان کی طرح ہماری یونانی و یہودی دنیا جدید مغربی تہذیب کے سولہویں صدی کے حملے سے پہلے ہی فائدہ اٹھا چکی تھی لیکن مشرق بعید میں مغربی تہذیب سے ماقبل یونانی یہودی اثرات ہندوستان کے مقابلے میں بہت کم اور معمولی تھے۔ یہ اثرات اس قدر کم تھے کہ وہ اپنی رشتہ دار مغربی تہذیب کے وہاں ظہور کے لیے راستہ نہ بنا سکتے تھے۔

اس وجہ سے جب سولہویں صدی میں مغربی تہذیب کے پرتگالی مہم جو بحری سفر پر نکلے تو جو سرزمین انہیں سب سے پہلے نظر آئی وہ چین اور جاپان کے ساحل تھے وہ وہاں ان خوف زدہ سیاحوں کی طرح اترے جو کسی دوسرے سیارے سے آئے ہوں۔ اس پہلی جدید مغربی لہر کا مشرق بعید کے لوگوں کے احساسات پر ملا جلا رد عمل ہوا۔ یہ تاثر سحر زدگی اور

نفرت کے ملے جلے جذبات کا ایک غیر پائیدار امتزاج تھا۔ اور اس پہلے تصادم میں بالآخر نفرت کے جذبات کو غلبہ حاصل ہوا۔ سولہویں صدی کے مغربی حملہ آوروں کی اس لہر کو واپس سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔

اس کے بعد جاپان، کوریا اور چین نے اپنے اپنے دروازے بند کر لیے اور یہ طے کر لیا کہ جتنے طویل عرصے تک ممکن ہو سکے ایک ''گوشہ نشین ریاست'' کی طرح زندگی گزاری جائے۔ تاہم یہ کہانی کا انجام نہیں ہے۔ جدید مغربی حملہ آوروں کو جاپان سے سترہویں صدی عیسوی میں نکال باہر کیا گیا تھا۔ تاہم مغربی حملہ آوروں نے دوبارہ انیسویں صدی عیسوی میں ہلہ بول دیا۔ اور اس دوسری کوشش میں وہ شرق بعید میں مغربی طرز زندگی کو متعارف کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت تک روس اور ہندوستان مغربی طرز زندگی سے متعارف ہو چکے تھے اور اسلامی دنیا کو اس سے متعارف کرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے اب صورت حال کے وہ کون سے اختلافات ہیں جنہیں ہم دیکھ سکتے ہیں اور نتائج کے اس اختلاف کو سمجھنے میں مدد دیں جو مشرق بعید کو فریفتہ کرنے کی مغرب کی دو یکے بعد دیگرے کوششوں میں تھا۔

ایک واضح فرق تو صنعتوں کا ہے۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں مغربی بحری جہاز اور ہتھیار (جنگی ساز و سامان) مشرق بعید کے بحری جہازوں اور ہتھیاروں سے اتنے زیادہ اعلیٰ نہیں تھے کہ جن کی بدولت مغرب کو غلبہ حاصل ہوتا۔ ان دو تہذیبوں میں تصادم کے اس پہلے مرحلے پر اہل مشرق بعید کا صورت حال پر غلبہ رہا۔ جب انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ تعلقات کو توڑنا چاہتے ہیں تو مغربی حملہ آوروں کے پاس ان کے اس فیصلے کے خلاف ڈٹ جانے کی قوت نہیں تھی۔ لیکن جب اہل مغرب انیسویں صدی میں چین اور جاپان کے ساحلوں کے درپے دوبارہ نمودار ہوئے تو طاقت کے ترازو میں زیادہ وزن مغرب کے پلڑے میں تھا کیونکہ چین اور جاپان کے پاس وہی ہتھیار تھے جو ان کے پاس دو سو سال قبل تھے۔ اس عرصے کے دوران اہل مغرب صنعتی انقلاب لے آئے تھے۔ اور اب دوبارہ زیادہ

ترقی یافتہ اور مؤثر ہتھیاروں سے مسلح ہوکر آئے جن کا مقابلہ مشرق بعید کی قوتیں نہ کرسکتی تھیں۔ ان نئے حالات میں مشرق بعید مجبور تھا کہ مغربی اثرات کو ایک طرح سے یا دوسری طرح سے قبول کرے۔ مشرق بعید کی ایک گوشہ نشین ریاست جو مغرب کی نئی صنعتوں کے چیلنج کا مقابلہ ٹیکنالوجی کو نظرانداز کرتے ہوئے کرنے کی کوشش کرتی تو دیکھتی کہ اس کے بند دروازوں پر مغرب کی بھاری توپیں گولہ باری کررہی ہیں۔ مغربی حملہ آوروں کو دور رکھنے کا صرف ایک ہی متبادل طریقہ تھا اور وہ طریقہ یہ تھا کہ انیسویں صدی کے مغربی فوجی سازوسامان بنانے کا ہنر حاصل کیا جائے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ مشرق بعید کے دروازے جدید صنعتوں کے لیے رضاکارانہ طور پر کھول دیے جائیں قبل اس کے کہ مغربی فاتحین زبردستی مشرق بعید میں گھس آئیں۔

جاپانی اس متبادل مسلک کو اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے میں چینیوں سے زیادہ تیز نکلے وہ متبادل مسلک یہ تھا کہ مغرب سے اپنی سلامتی و بقا کی حفاظت جدید ترین قسم کے مغربی ہتھیاروں کو استعمال کرنے اور بنانے کا علم حاصل کرکے کی جائے۔ اور چینیوں نے بھی آخر کار بروقت یہ مسلک اختیار کرکے خود کو ہندوستان جیسے حشر سے بچالیا کہ مغربی طاقت کے محکوم بن جائیں۔ تاہم یہ حکایت ابھی نامکمل ہے کیونکہ جب مغرب کو صنعتی انقلاب کی بدولت مشرق بعید پر صنعتی میدان میں جو فوقیت حاصل ہوئی وہ اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں مغربی قابضین کو نکال باہر کرنے اور مغربی دنیا سے تعلقات توڑ لینے کی تحریک کیوں ہوئی۔

مشرق بعید اور جدید مغرب کے تصادم کا یہ انجام پہلی نظر میں بڑا حیران کن دکھائی دیتا ہے کیونکہ جب پہلی مرتبہ اہل مغرب سولہویں صدی میں مشرق بعید کے افق پر نمودار ہوئے تو مشرق بعید کے لوگوں نے اپنے آپ کو اس وقت ان بالکل انجانے اجنبیوں کا استقبال کرنے اور ان کا طرز زندگی اختیار کرنے پر رضامند پایا جوانہوں نے تین سو سال بعد اس وقت ظاہر کی جب اہل مغرب دوسری مرتبہ اپنی خراب شہرت کے ساتھ آئے جوانہوں نے

اپنی پہلی آمد میں حاصل کی تھی۔ تاہم اس دوسرے تصادم میں مشرق بعید کے لوگ یقیناً مغرب کی طرف راغب ہونے میں متردد تھے۔ تاہم اس تصادم کا اختتام مشرق بعید کے مغربی طرز زندگی کو اپنانے پر ہوا۔ اس کے برعکس جہاں تک پہلے تصادم کا تعلق ہے اس کا آغاز خوش گوار استقبال سے اور انجام مغرب کو ٹھکرا دینے پر ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مشرق بعید کے مغرب سے تصادم کے ان دو ایکٹوں میں انتہائی اہم فرق کی وجہ کیا ہے۔ مغربی تہذیب کے بارے میں مشرق بعید کے لوگوں کا ان دو موقعوں پر مختلف ردعمل کسی بے قاعدگی یا متلون مزاجی کے سبب نہ تھا۔ انہوں نے مختلف ردعمل کا اظہار اس لیے کیا کیونکہ انہیں جن چیلنجوں کا ان دو مواقع پر سامنا کرنا پڑا وہ ایک جیسے نہ تھے۔ انیسویں صدی میں مغربی تہذیب نے اپنے آپ کو بنیادی طور پر ایک عجیب وغریب ٹیکنالوجی کے طور پر پیش کیا۔ اور سولہویں صدی میں اس نے اپنے آپ کو بنیادی طور پر ایک عجیب وغریب مذہب کے روپ میں پیش کیا تھا۔ یہ اختلاف کیا اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ مشرق بعید کے لوگوں کے دل و دماغ میں ان کی پہلی اور دوسری آمد پر مختلف ردعمل کیوں پیدا ہوا۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک عجیب وغریب صنعتی ماحول کو قبول کرنے سے یہ بہت زیادہ مشکل ہے کہ ایک عجیب وغریب مذہب کو قبول کیا جائے۔ صنعت زندگی کی سطح پر عمل کرتی ہے اور اسی وجہ سے یہ بات قابل محسوس ہوتی ہے کہ ایک غیر ملکی صنعت اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالے بغیر کہ جس میں انسان اپنی روح کو بھی اپنا کہنے کے قابل نہ رہے اختیار کیا جا سکتا ہے یقیناً غلط اندازے پر مبنی ہے۔

یہ نظریہ کہ کسی غیر ملکی صنعتی نظام کو اپنانے سے ایک شخص اپنے کندھوں پر ایک محدود ذمہ داری کا بوجھ لادتا ہے۔ حقیقت یوں محسوس ہوتی ہے کہ کسی ایک تہذیبی سانچے کے تمام عناصر باہم داخلی طور پر مربوط ہوتے ہیں۔ اس لیے جب کوئی اپنی روایتی صنعتوں کو ترک کرکے اس کی جگہ کوئی غیر ملکی صنعتوں کو اپناتا ہے تو اس کا اثر صرف زندگی کی سطح تک محدود نہ رہے گا۔ ان غیر ملکی صنعتوں کا اثر آہستہ آہستہ زندگی کی گہرائیوں تک اترتا جائے گا۔

یہاں تک کہ ایک ملک کی روایتی تہذیب کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہو جائیں گی اور غیر ملکی تہذیب کو اس تہذیبی شگاف سے داخل ہونے کا موقع مل جائے گا جو اس ملک کے ''تہذیبی دفاع'' کے بیرونی حلقے میں غیر ملکی صنعتوں کے حقیر داخلے سے پیدا ہو گیا تھا۔ آج کے چین' کوریا اور جاپان میں جب کہ اس تاریخ کو گزرے ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا جب مغربی صنعتوں نے پہلی مرتبہ ان ملکوں میں داخل ہونا شروع کیا تھا۔ اب ہم ان ملکوں کے سارے صنعتی عمل پر منفی انقلابی اثرات جو ہماری آنکھوں کے سامنے رونما ہو رہے ہیں تاہم وقت میں اس سارے عمل کا جوہر پنہاں ہے۔ اور ایک انقلابی نتیجہ جو آج ہم سب کی آنکھوں کے سامنے زندہ حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ آج سے سو سال پہلے مشرق بعید کے سیاست دان اس کی پیش بینی نہ کر سکے جب وہ بڑے متذبذب انداز میں اپنی دیواروں کے اندر ایک بیرونی صنعتی عمل کو داخل کرنے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ اہل مشرق بعید بھی اپنے ترک ہم عصروں کی طرح مغربی صنعتوں کی اتنی قلیل ترین مقدار اپنانا چاہتے تھے جو ان کے فوجی تحفظ کے لیے ضروری تھی۔ اور وہ اس حد سے آگے نہ جانا چاہتے تھے۔ تاہم اگر وہ مخفی قوتوں کے بارے میں کچھ شکوک رکھتے تھے کہ یہ مشین سے چلنے والا ''اسپ ٹرائے'' اپنے آہنی ڈھانچے میں ایک فوج کو چھپائے ہوئے ہے جو گھات لگائے بیٹھی ہے۔ اس کے باوجود غالب امکان یہی ہے کہ وہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہتے کہ اس گھوڑے کو چلاتے ہوئے اندر لے جائیں۔ کیونکہ انہوں نے یہ بات بڑے واضح طور پر محسوس کر لی تھی کہ اگر وہ اب ان غیر ملکی صنعتوں کو اپنانے میں پس و پیش سے کام لیں گے تو وہ جلد ہی مغربی فاتحین کے ہاتھوں میں صید زبوں ہوں گے۔ اور یہ مغربی فاتحین ان جنگی ہتھیاروں سے مسلح ہوں گے' جن کا اس وقت ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔ کسی مغربی طاقت کے ہاتھوں فتح ہونے کا بیرونی خطرہ ہی وہ فوری دھمکی تھی جس سے انیسویں صدی کے سیاست دانوں کو نپٹنا تھا۔ اگر مقابلتہً دیکھا جائے تو انجام کار مغربی صنعتوں کو اپنانے کے نتیجہ میں مغربی طرز زندگی سے جسم و روح کے فریفتہ ہونے کا خطرہ ایک دور از کار خطرہ تھا کہ جس خطرے سے

حفاظت کی ذمہ داری وقت پر ڈالی جا سکتی تھی۔ اس لیے انیسویں صدی میں مشرق بعید کے سیاست دانوں کے لیے ایک نئی اور قطعی طور پر برتر مغربی صنعتی عمل کو اختیار کرنا جہاں ایک طرف زبردست خطرے کا موجب تھا وہاں ایک لازمی ضرورت تھی۔ اس سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ اس مرتبہ مشرق بعید نے مغرب سے کچھ حاصل کیا جو کہ ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ مغربی صنعتوں کو اختیار کرنا اس متبادل یعنی اہل مغرب کے ہاتھوں مفتوح ومحکوم ہونے کے مقابلے میں جن کے ہتھیاروں کو وہ فوجی اور سیاسی بیمہ پالیسی کے طور پر اپنانے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ بہرکیف ایک معمولی برائی محسوس ہوتی تھی۔ دوسری طرف ''مغربی سوال'' جس سے مشرق بعید سے متعلق انیسویں صدی کے سیاست دانوں کے سترھویں صدی کے پیشرووں کو نپٹنا تھا خود کو ایک بالکل الگ صورت میں پیش کیا تھا۔

مغرب سے تصادم میں جس فوری خطرے کو جاپانی سیاست دانوں نے رد کرنا تھا وہ اپنے ملک کو سپاہ مغرب کے ہاتھوں (کہ جو نا قابل مزاحمت ہتھیاروں سے مسلح تھے) تاراج ہونے کا نظارہ نہیں تھا بلکہ وہ خطرہ اپنے لوگوں کو مغربی مشنریوں کی تعلیمات سے متاثر ہو کر ایک انتہائی دلکش غیر ملکی مذہب اختیار کرنے کا نظارہ تھا۔ یہ ممکن ہے کہ سترھویں صدی کے ان جاپانی مدبرین کو مذہب عیسائیت پر کوئی بہت بڑا اعتراض نہیں تھا۔ کیونکہ سترھویں صدی مغربی عیسائی واردین کے برعکس سترھویں صدی کے اہل مشرق بعید ان جراثیم سے محفوظ تھے جو ان کے ہم عصر اہل مغرب نے عیسائیت کے یہودی دور سے ورثے میں پائے تھے اور جن کا اب اس دور میں اپنے مادر وطن یورپ میں داخلی مذہبی جنگوں میں مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس زمانے کے چینی اور جاپانی مدبرین کنفیوشس ازم اور بدھ مت کی بڑی روادارانہ فلسفیانہ روایات میں پروان چڑھے تھے اور اگر انہیں شک نہ پڑتا کہ مغربی عیسائی مشنریوں کی مذہبی سرگرمیوں کی تہہ میں سیاسی مقاصد پنہاں ہیں تو پھر شاید وہ ایک دوسرے مذہب کو کام کرنے کے لیے ایک آزاد میدان فراہم کرنے میں معترض نہ ہوتے۔ جس چیز کا جاپانی مدبرین کو خوف تھا وہ یہ تھی کہ ان کے جن ہم وطنوں کو یہ غیر ملکی مشنریاں مشرف بہ عیسائیت

کررہی ہیں اور وہ اس نئے مذہب کی جنونی کیفیات کو اختیار کرلیں گے اور وہ اس مخرب اخلاق غلبہ کے تحت اپنے آپ کو اس حیثیت میں استعمال ہونے کی اجازت دے دیں گے جسے آج ہم مغرب میں ''ففتھ کالمسٹ'' (غدار) کہتے ہیں۔ اگر ان کا یہ مشکوک منصوبہ کامیاب ہوجاتا تو پھر پرتگالی اور ہسپانوی (کہ جو بلاواسطہ طور پر جاپان کی آزادی کے لیے تو بڑا خطرہ نہ تھے) بھی شاید جاپان کو جاپانی غداروں کے ہتھیاروں سے مسلح ہوکر فتح کرنے کے حیلے کرتے اور تدبیریں سوچتے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ سترھویں صدی میں جاپانی حکومت کی عیسائیت کو جلا وطن کرنے اور اس کا انسداد کرنے کی وہی غرض وغایت تھی جو آج بیسویں صدی میں مغربی حکومتوں کی کمیونزم کو جلاوطن کرنے اور اپنے ملکوں میں اس کے پھیلاؤ کے انسداد کی ہے اور یہ عنصر ان دونوں مغربی اعتقادات میں مشترک ہے۔ ان دونوں نے تشدد وتعصب یہودیت سے ورثے میں پایا ہے اور یہی تعصب وتشدد ایشیائی ممالک میں عیسائیت کی راہ کا سنگ گراں رہا ہے جہاں اس کی تبلیغ کی گئی ہے۔ غیر صنعتی معاشرہ مذکورہ بالا خطرے کی مشرف بہ عیسائیت غداروں کے استعمال ہونے سے زیادہ ایک اور اہم وجہ ہے۔ وہ اہم وجہ یہ ہے کہ صنعتیں پہلے مرحلے پر صرف زندگی کی سطح سے کھیلتی ہیں اور مذہب پہلے ہر مرحلے پر شجر حیات کی جڑوں تک اتر جاتا ہے۔ اگرچہ ایک غیر ملکی صنعتی عمل بھی انجام کار اس معاشرہ کی روحانی زندگی کو پارہ پارہ کرنے کی تاثیر رکھتا ہے کہ جس میں اسے ایک مرتبہ قدم جمانے کا موقعہ مل جائے تاہم اس اثر کی تاثیر کو ظاہر ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس وجہ کی بناء پر ایک جارحانہ تہذیب کہ جو خود کو مذہب کے پیرہن میں پیش کرتی ہے' اس تہذیب کے مقابلے میں کہ جو صنعتوں کے راستے سے داخل ہوتی ہے جلد ہی اپنے خلاف ایک زبردست اور بڑی تندوتیز مخالفت کی دعوت دیتی ہے۔ اور اب ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ مشرق بعید اور روس میں ہمارے مغربی تہذیب پہلے رد کیوں کی گئی اور پھر دوسری مرتبہ کیوں قبول کرلی گئی۔

روس میں پندرھویں صدی میں اور مشرق بعید میں سترھویں صدی میں مغربی تہذیب کو

اس لیے رد کیا گیا کیونکہ اس وقت یہ مغربی طرز عیسائیت پر ایمان لانے کی طلب گار تھی۔ اور یہ کوئی حادثہ نہ تھا کہ جونہی اہل مغرب کا اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کے بارے میں یہ رویہ ''پرجوش سپردگی'' سے سرد تشکیک'' میں تبدیل ہوا۔ ان کا مقدر دوران تبلیغ میں تین ناکامیوں سے بڑی حیران کن فتوحات میں بدل گیا۔ مغربی دنیا میں یہ عظیم روحانی انقلاب سترھویں صدی کے اختتام پر واقع ہوا جب کہ اہل مغرب کو متحارب مذہبی فرقوں کی بنیاد پر لڑی گئیں وحشی اور غیر فیصلہ کن جنگوں کے تجربے سے گزرتے ہوئے ایک سو سال ہو گئے تھے اور اب اہل مغرب نہ صرف مذہبی جنگوں بلکہ خود مذہب سے متنفر ہو گئے۔ مغربی دنیا نے مذہبی جنون کی برائیوں کے پریشان کن خود اذیتی تجربے کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار مذہب سے اپنا سرمایہ نکال کر اسے صنعتوں میں لگا کے کیا ہے۔ اور یہ ہماری مغربی تہذیب کی صنعتوں کا افادی اقتباس ہے۔ ہماری تہذیب کی اس بائیبل سے مذہبی تعصب وتشدد کا صفحہ پھٹا ہوا ہے۔ مذہب کے خلاف ہمارا یہ ردعمل پچھلی اڑھائی صدیوں میں جنگل کی آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل گیا...... پیٹر اعظم کی نسل سے لے کر کمال اتاترک کی اولاد تک ...... شاید ہم نے مغرب کے مشرق بعید پر یکے بعد دیگرے دو حملوں کے نتائج کے بڑے واضح اختلاف کی کسی توجیح کی تلاش میں اتفاقی طور پر ایک قانون دریافت کر ڈالا ہے (اگر کوئی اسے قانون کہنا پسند کرے تو) اس قانون کا اطلاق نہ صرف مشرق بعید کے معاملے پر ہوتا ہے بلکہ مختلف تہذیبوں کے تمام تصادمات پر ہوتا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ کسی تہذیب کا ایک جزو کہ جسے کل سے توڑ کر الگ کیا گیا ہو اور وہ کسی دوسرے ملک میں صرف اپنی چمک سے شعاع افشانی کرے تو توقع اس امر کی ہے کہ اسے بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس وجہ سے اس کے بڑی تیزی کے ساتھ آگے سفر کرنے کی امید جا سکتی ہے نسبتاً پوری تہذیب کے جب وہ اپنے تمام اجزا سمیت ضوافشانی کرے۔

ہماری مغربی صنعتی فکر جو ہماری مغربی عیسائیت سے طلاق یافتہ ہے کو نہ صرف چین اور جاپان نے قبول کیا ہے بلکہ روس اور کئی دوسرے غیر مغربی ملکوں نے کہ جہاں اسے اس سے

پہلے رد کر دیا گیا تھا کہ جب یہ ایک ناقابل تقسیم طرز زندگی کہ جس میں مغربی عیسائیت بھی شامل تھی، کے اہم جزو کے طور پر پیش کیا گیا۔

سترھویں صدی کے اختتام تک ہماری مغربی تہذیب کا ایک ٹکڑا تقریباً ساری دنیا پر یوں گرا جیسے روئی کے گالے گرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی تہذیب کے ایک جزو کی اس پذیرائی کا مقابلہ جدید دور کے آغاز میں غیر مغربی لوگوں کو مغربی طرز زندگی اپنانے کی تحریک کی عملی ناکامی سے کریں کہ جب ہماری مغربی تہذیب ردو قبول کے لیے مکمل کی مکمل پیش کی جا رہی تھی جس میں صنعت، مذہب اور سبھی کچھ شامل تھا تو پہلی نظر میں یہ پذیرائی بہت موثر نظر آئے گی۔ آج جب کہ مغرب کے دنیا جیتنے کے اعلان کو روس نے للکارا ہے تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری مغربی تہذیب کی صنعتوں کے میدان میں واضح فتح مشکوک ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جس نے اس کے اثر ونفوذ کو آسان بنایا تھا اور وجہ یہ ہے کہ یہ فتح سطح تک محدود رہی ہے۔ مذہب کے ساتھ نتھی ہونے کے بوجھ سے آزاد کرنے کی چالاکی کی اور اس چالاکی کی بنا پر اس نے اپنی صنعتوں کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔

لیکن اس داستان کے آئندہ باب میں مغرب کی صنعتی فکر کو روسیوں نے اٹھایا اور کمیونزم کے ساتھ اس کا عقد کر دیا اور مغربی صنعتوں اور مغربی بدعت یعنی کمیونزم کا یہ نیا اور بڑا مؤثر اتحاد مشرق بعید اور دوسری نوع انسانی کے سامنے ہمارے طرز زندگی کے مقابلے میں ایک حریف کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ داستان کے انیسویں صدی کے باب میں ہم اہل مغرب کو یہ دیکھ کر کہ جاپانی اور چینی جنھوں نے ہماری مغربی تہذیب کو اس وقت رد کر دیا تھا کہ جب اسے مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا تھا اور اس وقت قبول کر لیا جب اسے لادینی رنگ میں پیش کیا گیا کہ جس میں مذہب کے بجائے صنعتوں کو مقام شرف بخشا گیا تھا۔ ۱۸۶۰ء میں جاپان میں میجی انقلاب آیا اور چین میں ۱۹۲۰ء میں کومنتانگ انقلاب آیا۔ اس وقت یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ دونوں انقلاب دور جدید کے آخری دور کی لادینی مغربی تہذیب کے لیے فتوحات ہیں۔ تاہم ہم یہ دیکھنے کے لیے زندہ ہیں کہ مغرب کا یہ لادینی

نظام ان دونوں ملکوں میں مایوس کن نتائج سامنے لایا ہے۔ جاپان میں اس نے ایک آفت انگیز فوجی نظام کو جنم دیا اور چین میں اس نے ایک مصیبت خیز سیاسی بدنظمی کو پیدا کیا۔ دونوں ملکوں کو اس آفت نے ایک دردناک انجام سے دوچار کیا اور چینی آب وہوا میں لادینی قسم کی مغربی تہذیب کا پودا لگانے کی ہماری کوشش کی ناکامی کے بعد وہاں کمیونزم کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ وہ کیا وجہ ہے جس کی بنا پر چین میں کمیونزم کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔ اس کامیابی کا سہرا کچھ اتنا زیادہ کمیونزم کے لیے چینی جوش و جہاد کے سرنہیں جتنا زیادہ آخری دنوں میں چین کو لادین مغرب کے خطوط پر چلانے کی کومنتانگ کی کوشش سے مکمل مایوسی کے سر ہے۔ اور ہم یہ شبہ رکھنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر جاپانیوں کو بھی اپنے طرز پر چلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا تو وہ بھی اس منفی وجہ کی بنا پر کمیونزم کا شکار ہو چکے ہوتے۔

جاپان اور چین دونوں میں دو ایسی وجوہات پائی جاتی ہیں جو کمیونزم کے حق میں جاتی ہیں۔ پہلی وجہ تو ماضی میں لادین مغربی طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش سے مایوسی ہے اور دوسری وجہ ذرائع خوراک پر تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ ہے۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں ذکر کیا تھا۔ آبادی کا یہ دباؤ ہندوستان کی موجودہ مغرب زدہ حکومت کے لیے بھی ایک خطرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چین اور جاپان کو مغربی تہذیب کا لادینی سراپا پیش کرتے ہوئے ہم انہیں روٹی کے بجائے پتھر پیش کرتے رہے ہیں جب کہ روسیوں نے انہیں کمیونزم اور صنعتی شعور پیش کرتے ہوئے ایک خاص طرح کی روٹی پیش کی اور اگر آپ پسند کریں تو آپ اسے ''مٹی ملی سیاہ روٹی'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم وہ پھر ایک موروثی شے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں غذائیت کے کچھ اجزاء روحانی زندگی کے لیے بھی شامل کیے گئے ہیں جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا لیکن اگر چین اور جاپان ہماری مغربی تہذیب کا سولہویں صدی کا سراپا (کہ جس میں مغرب شامل تھا) ہضم نہیں کر سکے اور نہ ہی وہ انیسویں صدی کے ایڈیشن کو اپنی زندگی سے ہم آہنگ کر سکے ہیں کہ جس سے مذہب خارج تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب ان کے لیے کمیونزم ہی ایک متبادل راہ ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ چین اور ہندوستان میں سولھویں سترھویں صدی جب کہ کمیونزم کا کسی نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ ایک اور متبادل صورت پائی جاتی تھی کہ جسے مغربی عیسائیت کی یسوعی مشنریوں نے آزمایا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ تجربہ ناکامیوں سے ہم کنار ہوا۔ اس تجربے کی ناکامی اس کے اپنے داخلی نقائص کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ آپس کی بدنصیب رقابتوں اور یسوعی اور رومن کیتھولک مشنریوں کے نزاع کی وجہ سے ہوئی۔ چین اور جاپان میں یسوعیوں نے اس غلطی کا اعادہ نہ کیا جوانہوں نے جاپان میں کی تھی کہ وہ اپنی عیسائیت کی تعلیمات کو اس شے کا شکار نہ ہونے دیں کہ ان تعلیمات کا اہتمام مغرب کی جارحانہ طاقتوں کے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کیا جارہا ہے۔ یسوعیوں کا چین میں تبلیغ عیسائیت کی مہم کا طریقہ بڑا مختلف اور بڑا امید افزا تھا۔ اور آج تک یہی طریقہ بڑا کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہم تبلیغ کے اس راستے کا ذکر نہ کریں جو چین اور ہندوستان میں یسوعیوں نے اختیار کیا تو ایشیائی لوگوں کے مغرب سے تصادم کی بحث نامکمل رہے گی۔

یہ کوشش کرنے کی بجائے جیسا کہ ہم یسوعیوں کے زمانے سے کر رہے ہیں کہ مغربی تہذیب کے لادینی سراپا کو عیسائیت سے کاٹ کر الگ کرلیں۔ یسوعیوں نے یہ کوشش کی کہ وہ عیسائیت کو تہذیب کے غیر مسیحی عناصر سے الگ کرلیں اور عیسائیت کو ہندوؤں اور چینیوں کے سامنے مغرب کے ایک مقامی مذہب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک آفاقی مذہب کی حیثیت سے کہ جس میں تمام نوع انسانی کے لیے پیغام ہو' کی حیثیت سے پیش کریں۔ یسوعیوں نے عیسائیت کو اس کے اتفاقی اور غیر متعلقہ مغربی معاونین سے نجات دلائی اور عیسائیت کے خلاصے کو چین میں چینی اور ہندوستان میں ہندو علمی ادبی پیراہن میں پیش کیا کہ جس میں ایشیائی ادراک پر مغربی کشیدہ کاری کا کام بے جوڑ نہیں تھا۔ پہلی کوشش ہی میں یہ تجربہ اس زمانے کے رومن کیتھولک کے زیر اثر گھریلو جاگیروں کی غلطی سے ناکام ہوگیا۔ ان کا کوئی تعلق عیسائیت یا چین یا ہندوستان سے نہیں تھا۔ لیکن اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہندوستان' چین اور عیسائیت تمام ابھی تک نقشے پر موجود ہیں۔ اس لیے ہم یہ گمان کرتے

اور امید رکھتے ہیں کہ یہ تجربہ دوبارہ دہرایا جائے گا۔ چین میں عیسائیت سے طلاق یافتہ مغربی تہذیب پر کمیونزم کی فتح اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ چین میں تاریخ کے آئندہ باب میں عیسائیت کا کوئی مستقبل نہیں جو کہ ابھی تک ہمارے تاریخی افق سے نیچے ہے۔

تصادم کی نفسیات

اس کتاب کے پہلے چار ابواب میں ہم ان چار واقعات کا جائزہ لیتے رہے جن میں ہماری مغربی تہذیب کسی ہم عصر معاشرہ سے متصادم ہوئی۔ ان ابواب میں روس' اسلام، ہندوستان اور مشرق بعید کے مغرب کے بارے میں تجربات کا جائزہ لیا گیا۔ ہمارا جائزہ مظہر ہے کہ کسی غیر ملکی تہذیب کے ہاتھوں صدمہ اٹھانے کے ان چار مختلف تجربوں کی کئی خصوصیات آپس میں ملتی جلتی ہیں اور اس باب کا مقصد یہ ہے کہ گہرے تجزیے کے لیے نہ صرف معاصر دنیا کے مغرب کے ساتھ تصادمات بلکہ کسی بھی تہذیب کے کسی دوسری کے ساتھ ایسے تمام تصادمات کی نمایاں خصوصیات کو چنا جائے۔ ان خصوصیات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان تصادموں کی کوئی ایک مشترک نفسیات ہے اور یہ موضوع آج زبردست عملی دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہے۔ آج ہماری مغربی صنعتی ترقی کی کامیابیوں کی بدولت فاصلوں کا سمٹاؤ تقریباً نصف درجن معاشروں کو آمنے سامنے لے آیا ہے گویا یہ سب معاشرے عین نشانے کی سیدھ پر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کل تک اپنے طریقے کے مطابق زندگی گزار رہا تھا۔ ہمسایوں کے اثر سے اس طرح آزاد تھا جیسے ہر معاشرہ کو ایک ہی دنیا پر اپنی جنس کے دوسرے نمائندوں کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے کے بجائے اپنے الگ تھلگ سیارہ پر ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہو کر زندہ رہنے کی سزا دی گئی ہو۔

ہم اپنے تجزیے کا آغاز پچھلے باب کی ایک عام حقیقت سے کر سکتے ہیں۔ اس حقیقت سے پچھلے باب میں ہمارا سامنا اس وقت ہوا جب ہم اپنی مغربی تہذیب کے چین اور جاپان پر یکے بعد دیگرے کیے جانے والے دو حملوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ پہلے حملے کے موقع پر مغرب نے مشرق بعید کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ

وہ مکمل مغربی طرز زندگی کو اپنالیں۔ اس مکمل طرز زندگی میں ان کا مذہب اور صنعت بھی شامل تھی۔ تاہم یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ پھر ہم نے مشاہدہ کیا کہ اس ڈرامے کے دوسرے ایکٹ میں مغرب نے انہی اہل مشرق بعید کے سامنے مغربی تہذیب کو لادینی انداز میں پیش کیا کہ جس سے مذہب کو نکال باہر کیا گیا تھا اور مذہب کی جگہ صنعت کو مرکزی حیثیت دی گئی تھی۔ اور ہم نے مشاہدہ کیا کہ صنعتی پارہ کہ جو سترھویں صدی کے آخر میں ہماری تہذیب کے مذہبی بطن سے نکالا گیا تھا۔ یہ پارہ مشرق بعید کے معاشرے میں اپنی راہ نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس معاشرے نے پہلے مکمل مغربی طرز زندگی کو رائج کرنے کی کوشش کو رد کردیا تھا کہ جس میں مذہب صنعت اور سبھی کچھ شامل تھا۔

یہاں ہم ایک خاص مثال کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ جو عموماً اس وقت رونما ہوتی ہے کہ جب کسی گرم تاب تہذیب کی ثقافتی شعاع کسی دوسرے سے تہذیبی ڈھانچے پر شعلہ زن ہوتی ہے تو حملہ شدہ بیرونی ڈھانچے کی مزاحمت تہذیبی شعاع میں شامل عناصر کو بکھیر دیتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے روشنی کی شعاع تکون شیشے کی مزاحمت سے سات رنگوں میں منتشر کردی جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ علم نور کے مطابق روشنی کے ساتھ رنگوں میں سے کچھ رنگ اثر انگیزی کی قوت دوسروں سے زیادہ رکھتے ہیں اور یہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ یہی کچھ تہذیبی شعاع میں شامل مختلف روشنی کی لکیروں کا حال ہے۔ مغرب کے مشرق بعید پر اثر کے سلسلے میں مغربی تہذیب کی شعاع افشانی میں صنعت کی کرن نے اس مزاحمت پر غلبہ پالیا کہ جس نے اس سے پہلے مذہبی کرن کو رد کردیا تھا۔ مذہب اور صنعت کی تہذیبی کرن کی اثر انگیزی کی قوت کا یہ فرق کوئی ایسا امر نہیں ہے کہ جو صرف ان دو مخصوص تہذیبوں کے روابط کی تاریخ سے مخصوص ہو۔ یہاں ہم نے تہذیبی شعاع افشانی کے قوانین میں سے ایک کی نظیر کو اتفاقاً پالیا ہے۔

ایک تہذیبی شعاع میں صنعت، مذہب، سیاست اور فنون لطیفہ وغیرہ کی کرنیں شامل ہوتی ہیں۔ جب ایک برسر پیکار تہذیبی شعاع کسی بیرونی معاشرتی ڈھانچے کی مزاحمت کا

سامنا کرتی ہے کہ جس پر یہ حملہ آور ہوتی ہے تو اس میں شامل کرنیں بکھر جاتی ہیں تو یہ بات لازم ہے کہ اس تہذیبی شعاع کی صنعتی کرن مذہبی کرن کے مقابلے میں زیادہ تیز اور زیادہ آگے بڑھ کر اثر پذیر ہوگی۔ ہم اس قانون کو عام فہم زبان میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تہذیبی شعاع افشانی کے عمل میں ایک کرن کی قوت اثر پذیری عموماً اس کرن کی تہذیبی اہمیت کی نسبت معکوس ہوتی ہے۔

ایک مدہم تہذیبی کرن ایک خفیف جزو تہذیب سے حملہ شدہ معاشرتی ڈھانچے میں ایک تیز کرن کے مقابلے میں کم مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک مدھم کرن حملہ شدہ ڈھانچے کے روایتی طرز زندگی میں کوئی بڑی تند و تیز اور باعث ایذا ہلچل پیدا کرنے کی دھمکی نہیں دیتی۔

کسی تاب کاری تہذیب کے انتہائی خفیف عناصر کا خود کار انتخاب۔ غیر ممالک میں وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کے لیے یقیناً تہذیبی اختلاط کے کھیل کا ایک افسوسناک قانون ہے۔ لیکن ان ادنیٰ چیز پر یہ منافع کھیل کا خراب ترین نقطہ نہیں ہے۔ بکھرنے کا یہ عمل ہی کھیل کی جان ہے۔ یہ کسی معاشرے کی زندگی میں زہر بھرنے کی دھمکی دیتا ہے کہ جس کا معاشرتی ڈھانچہ منتشر کردہ تہذیبی شعاع کی کئی کرنوں کی زد میں ہے۔ اس نکتے کی تفہیم کے لیے طبیعات اور طب کی امثال استعمال کی جا سکتی ہیں۔

جب سے ہم نے ایٹم کو توڑنے کی ترکیب معلوم کی ہے ہم نے یہ سیکھا ہے کہ جونہی ایک ایٹم کے اجزا کی باترتیب جماعت بندی کو توڑ دیا جائے تو ایٹم کے اجزاء کی (کہ جو غیر جارحانہ شے پر مبنی ہوتے ہیں) غیر موجب ایذا کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ جلد ہی انتہائی خطرناک گھلا دینے والے مرض کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

ہم نے ایک اور بات بھی سیکھی ہے۔ اگرچہ یہ دور حاضر کے حوالے سے نہیں بلکہ ازمنہ قدیم کے انسان کے اب تک موجود الگ تھلگ رہنے والے نمائندوں سے سیکھی ہے۔ یعنی ایک بیماری جو ہمارے لیے معتدل ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ طویل عرصہ سے ہم

میں موجود ہوتی ہے کہ ہم اس کے خلاف ایک موثر مزاحمت پیدا کر لیتے ہیں۔ تاہم یہ مرض جنوبی سمندر کے جزیرہ نشینوں کے لیے (کہ جو اس کے جراثیم سے محفوظ تھے) انتہائی منفر نتائج کی حامل ہے کہ جب انہیں ان جراثیم کا اچانک اس طرح سامنا کرنا پڑا ہو کہ یورپی جتات یہ جراثیم اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے وہاں جا پہنچے ہوں۔

تہذیبی شعاع افشانی کے عمل میں ایک آزاد شعاع ایک آزاد الیکٹرون یا ایک آزاد متعدی بیماری کی طرح تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے کہ جب اسے اس نظام سے الگ کر دیا جائے جس میں اب تک وہ برسرِ عمل تھی اور اب اسے غیر ممالک میں ایک مختلف معاشرتی ڈھانچے پر مار کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اپنی اصل اور بنیادی ترتیب یہ تہذیبی شعاع یا جرثومہ یا الیکٹرون تباہی و بربادی پیدا کرنے سے مختلف تھا کیونکہ وہاں کے دوسرے کارندوں کی تنظیم نے اسے ایک خاص ضابطے میں جکڑ رکھا تھا اور اس ترتیب و تنظیم میں شامل تمام حصہ دار متوازن حالت میں تھے تاہم ان میں سے جب کوئی توازن کھو دیتا ہے تو تباہی و بربادی پیدا کرتا ہے۔

اپنی بنیادی تنظیم سے رشتہ توڑنے کے بعد آزاد جزو چاہے وہ جرثومہ ہو یا تہذیبی شعاع اپنی فطرت کو تبدیل نہیں کرتا تاہم اس کی وہی پہلے جیسی غیر ضرر رساں کیفیت نہیں رہتی کیونکہ اب وہ اپنی اصل تنظیم سے رشتہ توڑ لیتی ہے۔ ان حالات میں وُہی شے جو ایک شخص کے لیے جام حیات ہوتی ہے دوسرے کے لیے زہر قاتل بن جاتی ہے۔

دنیا اور مغرب کے درمیان تصادموں کا مجموعہ اس کتاب کا موضوع ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس اس فتنے کی ایک مسلم الثبوت مثال ہے جو ایک ادارہ پیدا کر سکتا ہے کہ جب اسے اپنی بنیادی معاشرتی ترتیب سے الگ کر دیا جائے اور اسے فتوحات کے لیے باہر بھیجا جائے۔ پچھلی اڑھائی صدیوں میں ہم نے اپنے ''قومی ریاستوں'' کے جدید مغربی سیاسی ادارہ کو دیکھا ہے کہ جب وہ بیرونی دنیا میں مشرقی یورپ، جنوب مغربی ایشیا اور ہندوستان میں پھیلا تو ان تمام علاقوں میں ''قومی ریاستوں'' کا تصور وہاں کے معاشرتی

نظام کا جزو نہیں تھا' لیکن یہ بیرونی ادارہ بہت سوچ سمجھ کر مغرب سے درآمد کیا گیا تھا۔ یہ اس وجہ سے درآمد نہیں کیا گیا تھا کہ یہ غیر مغربی دنیا کے مقامی حالات کے لیے موزوں تھے۔ بلکہ یہ صرف اس لیے مستعار لیا گیا تھا کہ مغرب کی سیاسی طاقت نے مغرب کے سیاسی اداروں کو غیر مغربی آنکھوں میں ایک غیر منطقی تاہم ناقابل مزاحمت عزت بخشی تھی۔

''قومی ریاستوں'' کے اس مغربی ادارے کے اطلاق سے ان علاقوں میں کہ جہاں یہ ادارہ ایک غیر ملکی درآمد تھا جو تباہی و بربادی مچی وہ اس نقصان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے کہ جو اسی ادارے نے انگلستان' فرانس اور دوسرے مغربی یورپ کے ممالک کو پہنچایا ان علاقوں میں یہ مصنوعی طور پر متعارف کروائی جانے والی ایجاد نہ تھا بلکہ یہ اسی سرزمین کی ایک قدرتی تخلیق تھا۔ اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک ہی ادارے کے دو مختلف معاشرتی حالات میں بڑے واضح طور پر مختلف اثرات مرتب کیے۔ ''قومی ریاستوں'' کا ادارہ مغربی یورپ میں مقابلتہً غیر ضرر رساں تھا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ ادارہ بنیادی طور پر یہیں پروان چڑھا اور چونکہ مغربی یورپ میں یہ زبانوں کی تقسیم اور سیاسی حدود کی قطار بندی کے مقامی تعلقات سے مطابقت رکھتا ہے۔

مغربی یورپ میں یہ ایک اتفاق ہے کہ ایک ہی زبان بولنے والے لوگ عموماً ایک ہی باہم پیوستہ اور مسلسل علاقے میں اکٹھے ہو گئے ہیں اور یہ علاقہ دوسری بڑی واضح لسانی حدود سے علیحدہ ہوتا ہے اور لسانی حد کی اپنی الگ پیوستہ سلطنت ہے۔

کسی علاقے میں جیسا کہ یہاں ہے اگر زبانیں رنگ برنگے ٹکڑوں سے بنے ہوئے لحاف کی طرح منقسم ہوں تو پھر لسانی نقشہ سیاسی نقشے کے لیے بڑی باسہولت بنیادیں فراہم کر دیتا ہے اور پھر ''قومی ریاستیں'' ان مخصوص معاشرتی حالات میں قدرتی تخلیق معلوم ہوتی ہیں۔

مغربی یورپ کی اکثر تاریخی سلطنتیں لسانی نقشے کے یک رنگ ٹکڑوں سے تقریباً تقریباً مطابقت رکھتی ہیں۔ اکثر علاقوں میں یہ مطابقت کسی مجوزہ منصوبے کے تحت نہیں پیدا کی گئی

بلکہ یہ پہلے سے قدرتی طور پر موجود ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ مغربی یورپ کے لوگ اپنی سیاسی وحدتوں کے لسانی قالبوں میں ڈھلنے کے مراحل سے نا آشنا تھے۔ اور اسی وجہ سے مجموعی طور پر قوم پرستی کی روح اپنے مادر وطن مغربی یورپ میں بخیر وخوبی چلتی رہی۔

مغربی یورپ کی قومی ریاستوں میں جن لسانی اقلیتوں نے اپنے آپ کو غلط سیاسی حدود میں پایا انہوں نے اکثر حالات میں اس ریاست کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا کہ جس میں اس کی زبان نہیں بولی جاتی تھی۔ اس وجہ سے اس کے ساتھ بڑی توجہ کا سلوک ہوا کیونکہ ان کی قومی زبان بولنے والی اکثریت کے ساتھ ایک ہی دولت مشترکہ کے شہریوں کی حیثیت سے بقائے باہمی ایک تاریخی حقیقت تھی۔ تاہم اس حقیقت کا جان بوجھ کر کسی نے اظہار نہیں کیا اور سب اس حقیقت کو امر واقعہ سمجھتے تھے۔

''قومی ریاستوں'' کا یہ مغربی یورپی ادارہ اپنے مادر وطن میں مقامی لسانی نقشے کی ایک قدرتی تخلیق تھا۔ آیئے اب دیکھیں کہ جب اس نظریے کی شعاع افشانی بیرونی دنیا کے ان علاقوں میں ہوئی کہ جہاں مقامی لسانی نقشہ بالکل ہی مختلف انداز کا تھا جب ہم نہ صرف مغربی یورپ بلکہ ساری دنیا کے لسانی نقشے کو دیکھیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مغربی یورپ کا مقامی انداز کہ جس میں زبانیں بڑے واضح' پیوستہ اور یک رنگ ٹکڑوں اور مختلف رنگوں کے واضح خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ لسانی نقشے کی تقسیم کا یہ انداز بڑا خاص اور غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ جنوب مشرق میں ڈانزگ اور ٹریسٹ سے لے کر کلکتہ تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے میں لسانی نقشے کا انداز رنگ برنگے ٹکڑوں سے بنے ہوئے لحاف کی مانند نہیں ہے۔ بلکہ یہ ریشم کے رنگ برنگے تاروں سے بنے ہوئے کپڑے کی مانند ہے۔

مشرقی یورپ' جنوب مغربی ایشیا' ہندوستان اور ملایا میں مختلف زبانیں بولنے والوں کی اس طرح واضح تقسیم نہیں ہے جس طرح مغربی یورپ میں ہے۔ وہ ان شہروں اور قصبوں کی ان گلیوں کے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ گھروں میں جغرافیائی طور پر ملے جلے ہوئے ہیں۔ اس مختلف اور زیادہ قدرتی معاشرتی ترتیب میں لسانی نقشہ کہ جس میں مختلف رنگوں

کے تار ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر بنے گئے ہیں۔ یہ نقشہ ریاستوں کے درمیان حد بندی کے لیے نہیں بلکہ افراد کے درمیان پیشوں اور تجارتوں کی تقسیم کے لیے سہل بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

سلطنت عثمانیہ میں مغربی یورپ کے بڑے واضح اور یکساں قومی ریاستوں کے ادارے کے اس غیرا کھاڑے میں تباہ کن داخلے سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ترک کسان اور منتظم تھے۔ Lazes (لیزز) ملاح تھے۔ یونانی ملاح اور دکاندار تھے۔ اہل آرمینہ بینکر، ساہوکار اور دوکاندار تھے۔ اہل بلغاریہ شاہی داروغے اور باغبان تھے۔ اہل البانیہ معمار اور تنخواہ دار سپاہی تھے۔ کرد چرواہے اور ظروف ساز تھے۔ اہل ولیکس چرواہے اور بساطی تھے۔ ان کی قومیتیں نہ صرف جغرافیائی حقیقت کی بنا پر ایک دوسرے میں ملی ہوئی تھیں بلکہ معاشی اور معاشرتی طور پر وہ ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ قومیتوں اور پیشوں میں یہ مطابقت اس دنیا میں ایک قدرتی بات تھی کہ جس میں لسانی نقشہ رنگ برنگے ٹکڑوں پر نہیں بلکہ رنگ برنگے تاروں سے بنا ہوا تھا۔

ثانی دنیا میں مغربی انداز پر قومی ریاستوں کو تشکیل دینے کی صرف یہی صورت تھی کہ رنگ برنگے تاروں سے بنے ہوئے نقشے کو لسانی انداز پر رنگ برنگے خانوں میں بدل دیا جائے۔ یہ کام صرف ظلم و تشدد کے طریقوں سے انجام پذیر ہوسکتا تھا اور ظلم و تشدد تقریباً سو سالوں سے توسیع ملک کے لیے اس علاقے کے کبھی ایک حصے پر اور کبھی دوسرے حصے میں Sude Tenland سے لے کر مشرقی بنگال تک استعمال کیا گیا ہے۔ اتنی بڑی تباہی ایک خیال یا ادارہ سے برپا ہوتی ہے جب اس خیال یا ادارہ کی تکنیک کو اس کی اصلی ترتیب سے جدا کر کے دوسرے ملک کے جدا معاشرتی حالات سے متصادم کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر تاریخی تہذیبی نظام ایک نامیاتی اکائی ہوتا ہے کہ جس کے تمام حصوں کی کارکردگی کا انحصار ایک دوسرے پر ہوتا ہے جب اس میں سے کوئی حصہ اپنی مکمل

ترتیب سے الگ کرلیا جاتا ہے۔ تو پھر الگ کیا ہوا حصہ اور مسخ شدہ مجموعی نظام اس ترتیب سے مختلف انداز میں کام کرتا ہے کہ جب اس نظام کے سارے حصے یکجا تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جو چیز ایک شخص کے لیے قند ہوتی ہے وہ دوسرے کے لیے زہر بن جاتی ہے اور اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ایک شے دوسری کی طرف رہنمائی کرتی ہے اگر ایک معاشرتی نظام سے صرف ایک جزو کو الگ کرلیا جائے اور اس جزو کو کسی دوسرے معاشرتی ڈھانچے سے متعارف کرایا جائے۔ یہ علیحدہ جزو اپنے بعد اس معاشرتی نظام (کہ جو اس کا مسکن تھا اور جہاں سے اسے زبردستی اور غیر فطری طور پر الگ کیا گیا تھا) کے اجزا کو اس غیر ملکی معاشرتی نظام کی طرف کھینچتے رہتے ہیں کہ جس میں وہ اقامت پذیر ہے۔

منتشر نظام اپنے آپ کو دوسرے غیر ملکی حالات میں دوبارہ منظم کرنا پسند کرتا ہے کہ جہاں اس کا ایک جزو پہلے سے راہ پا گیا ہو۔ اگر ہم تہذیبی اختلاط کے کھیل میں عملی طور پر ایک شے دوسری شے کی رہنمائی کرنے کے نظام کو دیکھنا چاہیں تو پھر آیئے ہم ایک دو ٹھوس مثالوں کو ملاحظہ کریں۔ پہلی مثال برطانوی پارلیمنٹ کی ۱۸۳۹ء کی رپورٹ ہے کہ جس میں مصر کے معاشرتی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں یہ درج ہے کہ ان دنوں اسکندریہ کا مرکزی ہسپتال زچہ بحری علاج خانہ کی چاردیواری کے اندر واقع ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات ہے تاہم اگر ہم حالات کی ان کڑیوں کا جائزہ لیں کہ جس نے یہ حیران کن نتیجہ پیدا کیا تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ایسا کرنا کتنا ناگزیر تھا۔ ۱۸۳۹ء تک مصر کے عثمانی گورنر جنرل محترم محمد علی پاشا کو اس زمانے کے مغربی ہتھیاروں سے خود کو لیس کرنے کے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے بیس سال گزر چکے تھے۔ مصر پر نپولین کی یلغار کی ناکامی نے محمد علی کی آنکھیں کھول دیں اور اسے بحری طاقت کا زبردست احساس دلایا۔ اس نے طے کرلیا کہ وہ ایک بحری فوج تیار کرے گا کہ جو اس زمانے کے مغربی طرز کے جنگی جہازوں پر مشتمل ہوگی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بحری طور پر اس وقت تک خود کفیل نہیں ہوسکتا جب تک وہ مغربی بحری جہازوں کو اپنی بندرگاہوں میں بنانے کے قابل نہ ہو۔ اور اس نے یہ بھی محسوس

کیا کہ وہ اس وقت بحری ماہرین فن مہیا نہیں کر سکتا کہ جب تک وہ مغربی جہازوں اور دوسرے ماہرین کو مصری شاگردوں کو تربیت دینے کے لیے نہ بلائے۔ اس لیے محمد علی نے مغربی ماہرین فن کے لیے اشتہار دیا۔ مغربی امیدوار اس عمدہ معاوضے سے کہ جو محمد علی پاشا نے پیش کیا تھا بہت متاثر ہوئے اور ان ملازمتوں کے لیے درخواست دینے کو بہت بے تاب تھے۔

اس کے ساتھ مغربی درخواست گزار اس وقت معاہدہ پر دستخط کرنے کو رضامند نہ تھے جب تک کہ انہیں اپنے اہل خاندان کو بھی ساتھ لانے کا یقین نہ دلایا جائے اور وہ اس وقت تک اپنے اہل خاندان کو ساتھ لانے کے لیے تیار نہ تھے جب تک ان کے خاندان کی حفاظت کے لیے اس وقت کے مغربی معیار کے مطابق طبی خدمات کی فراہمی کا یقین نہ دلایا جائے۔ محمد علی نے محسوس کیا کہ وہ فوری طور پر درکار بحری جنگی جہازوں کے مغربی ماہرین کو اس وقت تک اپنے ہاں ملازم نہیں رکھ سکتا جب تک وہ مغربی ڈاکٹروں کی خدمات بھی نہ حاصل کرے جو ان جنگی جہازوں کے ماہرین کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کریں گے۔ چونکہ اس کا دل مصری بحری فوج بنانے کی خواہش میں اٹک گیا تھا اس لیے اس نے ڈاکٹروں کی خدمات بھی حاصل کیں۔

ڈاکٹر، ماہرین اور ان کے اہل خاندان سب کے سب مغرب سے اکٹھے ہی مصر پہنچے ماہرین نے بڑے باضابطہ انداز میں اسلحہ ساز فیکٹری قائم کی۔ اور ڈاکٹروں نے بڑے مناسب طریقے سے اسکندریہ کی نئی مغربی برادری کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کی۔ ڈاکٹروں نے محسوس کیا کہ اپنے مغربی مریضوں کی دیکھ بھال کے فرض بخوبی انجام دینے کے بعد بھی ان کے پاس کام کرنے کے اوقات میں سے کچھ وقت باقی بچ جاتا ہے۔ چونکہ یہ ڈاکٹر بڑے سرگرم اور عوام کی خدمت کے لیے پر جوش تھے اس لیے انہوں نے مقامی مصری آبادی کے لیے کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر بات ہے کہ پہلی اہمیت زچگی کے کام کو حاصل تھی۔ اس لیے ایک زچہ ہسپتال بحری اسلحہ خانے کی حدود کے اندر قائم ہوا۔ جیسا کہ

آپ محسوس کریں گے واقعات کی ایک رو رونما ہوئی۔ اس کہانی کا نتیجہ وہ رفتار ہے کہ جس سے کسی تہذیبی اختلاط میں ایک چیز دوسری کی رہنمائی کرتی ہے اور یہ طریق کار انقلابی تبدیلیاں لانے میں بہت آگے تک جاسکتا ہے۔

مسلمان خواتین کا اپنے گھر سے باہر کے افراد کے ساتھ رابطے سے اجتناب کو اتنی شدت سے لاگو کیا گیا تھا کہ اٹھارویں صدی کے ترکی میں جب سلطان کی نہایت ہی محبوب بیوی اتنی شدید بیمار ہوئی کہ اس کی زندگی خطرے میں تھی تو اس مرحلے پر بھی اسلامی طرز معاشرت کے اصول جو زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے وہ یہ تھا کہ مغربی ڈاکٹر کو اتنے گراں قدر شاہی مریض کے لیے کچھ کرنے کی اجازت بس اتنی تھی کہ وہ ناقابل دید خاتون کے بستر پر کھینچے ہوئے پردوں میں سے نکلے ہوئے ایک ہاتھ کی نبض دیکھ سکے۔ یہ اس مریض کا انتہائی قرب تھا کہ جس کی ایک مغربی ڈاکٹر کو اجازت دی گئی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ یہ مریض اس حکمران کے انتہائی عظیم خزانوں میں سے ایک تھا کہ جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مطلق العنان تھا۔ ان دنوں سلطان کی مطلق العنانیت کسی بھی اسلامی معاشرتی رواج کو رد کرنے کے معاملے میں اس حد تک ناکارہ تھی کہ وہ زندگی اور موت کے مسئلے پر بھی کہ جو مطلق العنان حاکم کے نزدیک اپنے دل سے زیادہ اہم تھا' کچھ کر سکنے کی پوزیشن میں نہ تھا اور اب اس زمانے میں مسلمان خواتین بڑی جرأت سے ایک غیر ملکی اسلحہ ساز فیکٹری کی حدود میں غیر مسلم مغربی وضع حمل کے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے بے دھڑک داخل ہوتی ہیں۔ مرد و زن کے معاشرتی روابط کے بارے میں اسلام کے روایتی نظریات کی نفاست میں یہ دہشت انگیز رخنہ اندازی مصری پاشا کے مغربی انداز میں اپنی بحری فوج کو تیار کرنے کے فیصلے کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ پہلی نظر میں یہ غیر مجوزہ اور دور از کار معاشرتی اثر صنعتی عمل کو اپنانے کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔

معاشرتی تاریخ کا یہ حصہ اگرچہ بہت خوش گوار ہے تاہم غیر نمائندہ نہیں ہے۔ یہ واقعہ ہمیں وہ پیمانہ مہیا کرتا ہے کہ جس سے ہم انیسویں صدی کے ترک سیاست دانوں کے خود

قربی کے درجات کو ناپ سکتے ہیں۔ جب انہوں نے یہ سوچا کہ جب وہ اپنے ملک کو مناسب قسم کے مغربی ہتھیاروں سے لیس کریں گے تو اس مرحلے پر پہنچ کر وہ مغربیت کے نظام کو اپنی مرضی کے مطابق مرحلہ وار اختیار کرلیں گے۔ ہمارے اپنے زمانے میں مصطفیٰ کمال اتاترک کے وقت تک عثمانیوں نے ازخود یہ تسلیم کیا کہ تہذیبی اختلاط کے کھیل میں ایک شے دوسری شے کو اپنے ساتھ کھینچنے پر مجبور ہے۔ یہاں تک کہ مغربی ہتھیار ڈرل اور وردیاں اپنے ساتھ نہ صرف مسلمان عورتوں کی آزادی بھی لے آئیں گے بلکہ عربی رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدل بھی دیا جائے گا اور اسلامی عبادت گاہ کو سرکاری معاملات سے علیحدہ کردیا جائے گا۔ حالانکہ ماضی میں اسلامی عبادت گاہ مسلمان ملکوں میں زندگی کے تمام شعبوں پر بے چیلنج حکمرانی کرتی رہی ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں ہندوستان میں کمال اتاترک کے ہم عصر مہاتما گاندھی نے تہذیبی اختلاط کے انداز کو کہ جس میں کہ ایک شے اپنے ساتھ چپکے چپکے دوسری چیزوں کو بھی کھینچ لاتی ہے۔ بخوبی محسوس کیا۔

گاندھی نے دیکھا کہ سوت کے کروڑوں ریشے جو ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں اور لنکا میں کاتے جاتے ہیں اور وہیں ہندوستانیوں کے لیے کپڑا بھی بنا جاتا ہے۔ یہ سوت کے تار ہندوستان کے لیے بہت خطرناک تھے جو ہندوستان کو مغربی دنیا کے ساتھ منتھی کرنے کے مکڑی کا بنا ہوا جال تھے۔ مکڑی کے یہ جالے جلد ہی اتنے سخت ثابت ہوں گے جتنی لوہے کی بیڑیاں ہوتی ہیں اور پھر ان کو توڑنا بہت مشکل ہوگا۔

گاندھی نے محسوس کیا کہ اگر ہندوستانی مغرب میں مغربی مشینوں سے تیار کردہ کپڑا پہنتے چلے گئے تو پھر وہ جلد ہی اس مقصد کے لیے ہندوستان میں مغربی مشینری کا استعمال کردیں گے۔ پہلے مرحلے پر وہ انگلینڈ سے خودکار کرنیں اور بجلی سے چلنے والی کھڈیاں درآمد کریں گے اور پھر وہ ان اوزاروں کو خود بنانا سیکھیں گے اس کے بعد وہ اپنے کھیتوں کو سوتی کپڑا بننے کی ملوں اور ہندوستانی فونڈریوں میں کام کرنے کے لیے چھوڑ دیں گے اور جب وہ اپنے کام کے اوقات کو مغربی کاموں میں صرف کرنا شروع کردیں گے تو پھر وہ اپنی

فرصت کے اوقات کو مغربی ناطق و متحرک فلموں' ٹاکیز' شکاری کتوں کی دوڑوں اور ایسے ہی دوسرے مشاغل میں صرف کریں گے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے جسموں میں مغربی روحیں پرورش پاتی ہوئی محسوس کریں گے اور یہ بھولنے لگیں گے کہ ہندو کیسے بنا جاتا ہے۔

مہاتما گاندھی نے پیغمبرانہ نگاہ سے دیکھا کہ ایک بنولہ کس طرح بڑھ کر ایک گھنے پودے میں تبدیل ہو جائے گا' جس کی پھیلی ہوئی شاخیں سارے برصغیر کو ڈھانپ لیں گی۔ اس ہندو مصلح نے اپنے ہندو ہم وطنوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی ہندو روحیں اس مغربی درخت کی جڑوں میں کلہاڑا رکھ کر محفوظ کر سکتے ہیں۔ گاندھی نے اپنے اہل وطن کے لیے یہ مثال قائم کی کہ وہ ہر روز کچھ وقت پرانے ہندوستانی طریقے کے مطابق ہاتھ سے ہندوستانی روئی کاتنے اور کپڑا بننے میں صرف کریں۔ تاکہ ہندوستانی جسم یہ کپڑا پہن سکیں۔ گاندھی نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان اور مغرب کے درمیان ابھرتے ہوئے معاشی رابطوں کا انقطاع ہی وہ واحد اور یقینی ذریعہ ہے جس سے ہندو معاشرے کو جسمانی اور روحانی سطح پر مغربی ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی بصیرت میں کوئی نقص نہ تھا۔ ہندوستان کی مغرب پرستی کے بارے میں مہاتما نے پہلے ہی بدشگونی کی تھی اور اسے اس راہ پر چلنے سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ تاہم آج ہندوستانی اس مغربیت کو روئی کے بیج کے ثمر کے طور پر بڑی تیزی سے اپناتا جا رہا ہے۔ اور گاندھی نے اس مغربی چھوت کا جو علاج تجویز کیا تھا وہ درست تھا۔ مگر مصلح معاشی تنگی کی قیمت پر ہندوستانی طرز معاشرت کی آزادی کو محفوظ رکھنے پر اپنے چیلوں کو آمادہ نہ کر سکا۔ ہندوستانیوں کو گاندھی کے زمانے میں مشین کے بنے ہوئے سوتی ملبوسات پہننے سے اس وقت منع نہ کیا جا سکا جب تک کہ ہندوستان کے کسانوں کے معیار زندگی کو اور کم نہ کر دیا گیا جو کہ پہلے ہی ناقابل برداشت حد تک کم تھا اور جب تک ہندوستانی کے سوتی کپڑے کے کاریگروں اور مل مالکوں کو ان کے کاروبار سے محروم نہ کر دیا گیا۔ یہ کاریگر اور مل مالکان پہلے ہی ہندوستانی سرزمین پر بمبئی اور گاندھی کے دوسرے وطن احمد آباد میں ابھر آئے تھے۔

گاندھی نے ہندوستان اور دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم اور پائیدار نقش قائم کیا تاہم تاریخ کی طنز نے گاندھی کی یہ نقش بنانے پر مذمت کی کہ گاندھی نے ہندوستان کو اقتصادی شعبہ میں مغرب کی تقلید سے بچا کر سیاسی میدان میں اسے مغربیت کی راہ پر ڈال دیا۔

مغرب کی سیاسی تقلید سے یہاں ہماری مراد مغرب کی سیاسی منزل یعنی خود مختار قومی حکومت کے لیے گاندھی کی کامیاب رہنمائی سے ہے۔ گاندھی کی غیر معمولی ذہانت بھی بے درد معاشرتی عمل کا مقابلہ نہ کرسکی۔

ایک تہذیبی تصادم میں جب حملہ شدہ معاشرے کے دفاع میں نہایت ہی چھوٹا سا رخنہ بنا لیا جاتا ہے تو پھر ایک چیز بڑے ہی سنگدلانہ طریقے سے دوسرے کو اپنے ساتھ کھینچتی ہے۔ ہماری تحقیق نے یہ واضح کر دیا ہے کہ کسی غیر ملکی تہذیب کو اپنانے کا عمل بڑا تکلیف دہ ہے۔ یہ مہم بڑی پر خطر اور جان جوکھوں میں ڈالنے والی ہوتی ہے۔ تاہم شکار ہونے والے معاشرے کی ان جدید طریقوں سے روایتی اور طبعی ناموافقت ہوتی ہے۔ یہ جدید طریقے شکار ہونے والے معاشرے کے روایتی طرز زندگی کو تہ و بالا کر دیتے ہیں اور اسی لیے وہ اس تجربے کو ان کے لیے بدتر قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ حملہ سے اپنی دفاعی فصیلوں کے شگافوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے وہ معاشرہ غیر ملکی تہذیبی شعاع کو اس میں شامل کرنوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اور پھر وہ اس تہذیب کے نہایت ہی ادنیٰ اور بدیشی طرز زندگی کے زہریلے حصوں سے نہایت ادنیٰ اور کم تہ و بالا کرنے والے حصوں کو بادل ناخواستہ داخلے کی اجازت دے دیتا ہے۔ وہ یہ اجازت اس امید پر دیتا ہے کہ اس سے انہیں چھٹکارا مل جائے گا اور مزید رعایتیں نہیں دینی پڑیں گی۔ تاہم جب ایک چیز کا دوسری کو کھینچنا ایک ناگزیر عمل ہے تو پھر وہ معاشرہ اس زبردستی گھس آنے والے تہذیب کے باقی ماندہ حصے کو بھی آہستہ آہستہ قبول کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ شکار ہونے والے معاشرے کا زبردستی گھس آنے والی اجنبی تہذیب کے بارے میں عام رویہ خود شکستگی کا ہوتا ہے جو مخالفت و مخاصمت کی پیداوار ہوتا ہے۔

ہمارے جائزہ لینے کے عمل میں خصوصی توجہ کا طلب گار ایک ایسا موقع آیا جس میں ہم نے دیکھا کہ غیر مغربی ملکوں کے کچھ سیاست دان کہ جن کے ممالک مغرب کے حملوں کا شکار ہوئے غیر معمولی نگاہ رکھتے ہیں جس سے انہوں نے دیکھا کہ جب کوئی معاشرہ کسی زیادہ جاندار بدیشی تہذیب کی شعاع افشانی کے شعلوں کی لپیٹ میں ہوتو پھر اسے یا تو بدیشی طرز زندگی کو مکمل طور پر اپنا لینا چاہیے یا تباہی سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ پیٹر اعظم، سلیم سوم، محمود دوم، محمد علی، مصطفیٰ کمال اتاترک اور میجی دور حکومت کے جاپان کے ''بزرگ سیاست دانوں'' کی شخصیات اس سے پہلے ہماری آنکھوں سے گزر چکی ہیں۔ تہذیبی جارحیت کے چیلنج کا یہ مثبت اور تعمیری جواب ان کے تدبر کا بہترین ثبوت ہے کیونکہ یہ جواب قدرتی میلانات پر ایک فتح کی حیثیت رکھتا ہے۔ کچھوا مچھلی جو حملہ آور کو دیکھ کر اپنا خول بند کر لیتی ہے یا کچھوا اپنے خول میں بند ہو جاتا ہے یا خار پشت خود کو ایک نوکیلے گیند کی شکل میں لپیٹ لیتا ہے یا شتر مرغ جو کہ اپنے سر کو ریت میں چھپا لیتا ہے۔ یہ ہمارے منفی طرز کے قدرتی ردعمل ہیں۔

اس متبادل ردعمل کی مسلم الثبوت مثالیں روس اور اسلام کے مغرب کے ساتھ تصادم کی تاریخوں میں ملتی ہیں۔ ایک جارحانہ بدیشی تہذیب کے ساتھ اس کے اپنے ہتھیاروں سے لڑنے کا فن سیکھنے کی پالیسی رجعت پسندانہ ذہنوں میں بڑے شکوک وشبہات پیدا کرے گی۔ کیا تمہارے سیکڑوں پیٹر اور مصطفیٰ کمال اتاترک اپنے دفاع کو جدید بنانے کے حیلے کی آڑ میں قلعہ کو بیچ رہے ہیں۔ کیا زبردستی گھس آنے والی ایک اجنبی تہذیب کا یہ بہترین جواب نہیں کہ اس منحوس چیز سے تعلق بڑے قوی اور مصمم ارادے سے منقطع کر لیا جائے۔

اگر ہم اس مقدس قانون کے جو ہم پر ہمارے آباؤ اجداد کے خدا نے اتارا ہے ہر ہر جزو کی بڑی احتیاط کے ساتھ پیروی کریں تو پھر کیا خدا کے دل میں ہمارے لیے ہمدردی کا جذبہ نہ پیدا ہوگا اور کیا وہ ہمارے لیے ملحد و بے دین دشمنوں سے دفاع کے لیے اپنے بائیں بازو کی خدائی قوت نہ نازل فرمائے گا۔ یہ تھا روس میں پرانے مومنین کا ردعمل جنہوں نے

معمولی سے ردّو بدل کی خاطر شہادت سے دو چار ہونا پسند کیا۔ تاہم غیر ملکی آنکھوں میں یہ معمولی ردّو بدل غیر اہم تھا۔ ان کے خیال میں روس کے ان قدامت پسندوں کا رویہ کلیسائی ظاہر پرستی کا شاخسانہ تھا اور اسلامی دنیا میں وہابیوں' سنوسیوں' ادریسیوں' اہل حدیثوں اور دوسرے اجتہاد پسند فرقوں کا بھی یہی ردعمل تھا۔ ان سب نے خدا کی راہ میں جنگ لڑنے کے لیے مرتد عثمانیوں کے خلاف ہلہ بول دیا۔ ان متشدد مومنین کے خیال میں ان مرتدین نے مغرب کی راہ پر چل کر اسلام کو دھوکا دیا ہے۔ سوڈانی متشدد مومن صنعتی عمل کے حامی روسی پیٹر کی ضد ہے تاہم نہ تو باہر سے نئی درآمدہ صنعتوں کو مکمل طور پر اپنانے کا رویہ اور نہ ہی روایتی طرز زندگی کو محفوظ کرنے کا پرجوش جذبہ ہی ایک حملہ آور تہذیب کے جواب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ حرف آخر کیا ہے تو پھر ہمیں تاریخ کے اگلے باب میں جھانکنا ہوگا۔ جو کہ مغرب کے دنیا کے ساتھ تصادم کی ادھوری داستان میں بلکہ آج تک مستقبل میں چھپا ہوا ہے۔ اگر ہم دنیا کے یونان اور روم کے ساتھ تصادم کی تاریخ کی طرف رجوع کریں تو ہم یہ گم کردہ باب بہم پہنچا سکتے ہیں۔ اس ضمنی قصے کے واقعات میں تاریخ کے ملفوف صفحات پہلے ہی شروع تا آخر کھلے پڑے ہیں۔ بلکہ یہ ساری کتاب کہنہ ہماری جانچ پڑتال کے لیے حاضر ہے۔ یونان وروما کے ماضی کے حالات سے شاید ہمارے مستقبل کے بارے میں تعبیر کرنا ممکن ہوسکے۔ آیئے دیکھیں کہ ہم یونان وروما کی اس دستاویز سے کیا کام لے سکتے ہیں۔

دنیا اور اہل یونان و روما

جیسا کہ ہم سب ذاتی تجربے سے جانتے ہیں کہ زندہ مخلوقات کو جن کمزوریوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے ان میں سے ایک خود پسندی ہے اور نرگسیت کی شکار مخلوقات میں یہ خود پسندی ایک فریب کو جنم دیتی ہے۔ ہر ذی روح قبیلہ اور فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ بڑی منتخب نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنی بے مثل قدر پر ہمارے ایمان میں جو جھوٹ کا عنصر شامل ہوتا ہے وہ آسانی سے ہمارے سامنے ظاہر نہیں ہوتا۔ ہم اس مغالطے کو بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ اگر معاملہ یہ ہو کہ کوئی دوسرا بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس فریب سے بغل گیر ہو تو پھر اس مغالطے کو ہم بڑی آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہم اہل مغرب بتقضائے بشریت اس احساس کی طرف میلان رکھتے ہیں کہ ہم نے پچھلی چند صدیوں میں جو کچھ دنیا کو دیا ہے اس کی اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہمارے اس مغربی واہمے کا ایک موثر علاج یہ ہے کہ ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں کہ اہل یونان و روما نے دنیا کو کیا کچھ دیا ہے اور اس بات کو کوئی زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا ہے۔ ہمیں معلوم ہوگا کہ انہوں نے بھی اپنے زمانے میں دنیا کو تاخت و تاراج کیا۔ اور وہ بھی ایک زمانے میں یہی سمجھتے تھے کہ وہ عام لوگوں سے الگ کوئی مخلوق ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم دنیا کے اہل یونان و روما کے ساتھ تصادم کی داستان کے اختتام پر پہنچیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس ضمنی قصے میں عارضی طور پر غالب یونانی و رومی معاشرے کا اپنی قدر کے بارے میں اندازہ تاریخ کے تلاش حق کے جویا ترازو میں تلنے کے امتحان سے گزرنے کے بعد غلط ثابت ہوا۔ مغربی دنیا میں توسیع پندرھویں صدی کے اواخر میں سمندروں پر ہماری ڈرامائی فتح سے ہوا۔ یونان و روما کی تاریخ میں سکندر اعظم کی

نسل کے بعد چوتھی صدی قبل مسیح میں خشکی پر یونان کی توسیع بھی اس طرح کا واقعہ ہے۔

سکندر اعظم کے ایشیا کے اس پار ڈارڈنلز سے لے کر پنجاب تک بڑھتے چلے آنے سے عالمی توازن میں اسی طرح انقلابی تبدیلی واقع ہوئی جس طرح واسکوڈے گاما اور کولمبس کی بحری مہموں سے ہوئی۔ اس کے بعد آنے والی نسلوں نے بڑی فتوحات حاصل کیں۔ دوسری صدی قبل مسیح میں اہل یونان نے ہندوستان کو بنگال تک فتح کرلیا اور اسی صدی میں رومیوں نے دنیائے یونان و روما کے لیے بحراوقیانوس کے سامنے کا حصہ فتح کرلیا۔ جہاں آج کل جنوبی اسپین اور پرتگال واقع ہیں۔ عیسائی دور کی پہلی صدی میں عہد نامہ جدید قدیم یونانی زبان میں تحریر ہوا تھا یہ زبان ٹریونیکور سے لے کر مارسیلز کے ہنٹر لینڈ تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

اسی زمانے میں برطانیہ کو رومی ہتھیاروں کے بل بوتے پر دنیائے یونان و روما سے منتقی کیا جارہا تھا جب کہ یونانی فنون لطیفہ ایک ہندوستانی مذہب بدھ مت کی خدمت براری کرتے ہوئے بڑے سکون کے ساتھ شمال مشرق کی سمت افغانستان کے ساتھ ساتھ خشکی کے راستے پھیل رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ بالآخر یہ ایک طرف چین میں اور دوسری طرف کوریا سے لے کر جاپان تک پہنچے گا۔ اس لیے جہاں تک علاقائی حدود کا تعلق ہے۔ اپنے زمانے میں یونانی و رومی تہذیب دنیائے قدیم کے اتنے وسیع علاقے میں پھیل گئی جتنا کہ ہماری مغربی تہذیب اپنے زمانے میں پھیلی اور اس زمانے میں پھیلے گی جس نے ابھی تک امریکہ کی مقامی تہذیبوں کے ظہور کو نہیں دیکھا۔ یونانی بھی اسی طرح بڑھا نک سکتے تھے۔ جیسا کہ ہم آج کل ہانک رہے ہیں کہ ہم عصر تہذیبوں سے (ان ہم عصر تہذیبوں کے ڈھانچے اور وسعت کا یونانیوں نے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا ہوا تھا) کوئی بھی تہذیب ان کی فاتح عالم تہذیب کی ضو افشانی سے نہ تو بچ سکی اور نہ ہی متاثر ہوئے بغیر رہی۔ چوتھی صدی قبل مسیح اور اس کے مابعد یونانی تہذیب نے ساری دنیا پر جو اثر مرتب کیا اس نے دنیا کو اتنا شدید صدمہ پہنچایا جتنا کہ جدید مغربی تہذیب پندرھویں صدی سے ہماری دنیا کو پہنچا رہی ہے۔

چونکہ پچھلے چند ہزار سالوں میں انسانی فطرت میں کوئی واضح تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس لیے اگر ہم دنیا کے اپنے ساتھ تصادم کی تاریخ میں یہ دیکھیں کہ کسی حملہ آور تہذیب کے خلاف پائے جانے والے نفسیاتی ردِّ عمل پہلے سے طے شدہ معیار کے مطابق تھے تو اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تاریخ کا یہ حصہ اپنے انتہا پسند مہدیوں اور اعتدال پسند عظیم پیٹروں دونوں کو جمع کر سکتا ہے۔

مثال کے طور پر ایشیائے صغیر میں عظیم پیٹر کی طرز کا ایک ایرانی بادشاہ عظیم میتھر یڈٹس تھا۔ جس نے اپنے سپاہیوں کو رومی طرز پر عسکری تربیت دی۔ انہیں رومی اسلحہ سے لیس کیا۔ اور جو اہل یونان اور ان کی تہذیبوں کے سرپرست اور علمبردار کی حیثیت سے رومیوں کے مدمقابل میدان میں اترا۔ عظیم ہیروڈ جو کہ جوڈیا کا بادشاہ تھا اور سائیکی کے کام سے مغلوب ہوا۔ ہیرڈ کا خود اختیار کردہ مشن فلسطینی رعایا کو اس بات کی تعلیم دینا تھا کہ وہ یونانی تہذیب اور رومی قوت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کی حفاظت پر آمادہ ہو جائے۔ یہ مصالحت ایک چھوٹی سی مشرقی سلطنت کے لیے اشتعال انگیزی اور مکمل تباہی و بربادی سے دوچار ہونے کے خطرے کے تباہ کن عمل کے مقابلے میں بہترین متبادل کی حیثیت رکھتی تھی۔ تاریخ کی لادینی حقیقتوں کے بارے میں ہیروڈ کی مصلحت آمیز قسم کی صلح کن پالیسی کو قدامت پرست فلسطینی مہدیوں کی ہٹ دھرمی سے شکست ہوئی۔

یہ مجاہدانہ تحریک دوسری صدی قبل مسیح میں جنوب مغربی ایشیا کے یونانی بادشاہ کی یونانی بنانے کی پالیسی کے خلاف غضب ناک بغاوت کے بعد شروع ہوئی۔ جو کوئی بھی مقدونیوں کی پہلی اور دوسری کتاب پڑھے گا وہ مقدونیوں کی ۱۶۶۔۱۶۵ ق م میں فلسطین میں بغاوت اور مہدی محمد احمد کی ۱۸۸۱ء میں مصری سوڈان میں بغاوت کے درمیان زبردست مشابہت دیکھ کر چونک اٹھے گا۔

یونانیت کی پالیسی کے خلاف فلسطینی یہودیوں کی پرجوش دینی مزاحمت کا شعلہ تھیوڈس اور جوڈا (کہ جن کی واضح ناکامیوں کی نظیر حواریوں کے کارناموں میں گیمبل نے فراہم کی)

کی بغاوتوں میں ٹمٹمانے کے بعد مسیحی دور کی دوسری صدی میں بار کوکیبا کی بغاوت میں اپنی آخری بھڑک کو پہنچا۔ بار کوکیبا نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ مسیح ہے۔ رومن بادشاہ ہیڈوریا نے اسے کچل دیا۔ یونانی رومی تہذیب کے خلاف مشرقی تحریک مزاحمت کے فلسطینی یہودی رہنما ہی صرف اس کے نمائندہ نہیں تھے۔ اس سے پہلے تیسری صدی قبل مسیح میں مصر کے مقامی فوجیوں نے "ہندوستانی غدر" سے ملتی جلتی ایک بغاوت کی۔ مصر کے ان مقامی فوجیوں کو مصر کے یونانی بادشاہ نے جنوب مغربی ایشیا کے اپنے یونانی ہم عصر کے حملوں سے دفاع کے لیے یونانی طرز پر فوجی تربیت دی اور یونانی اسلحہ سے لیس کیا۔ یونانی طرز کی عسکری تربیت حاصل کرنے والے مصری فوجیوں نے حملہ آور فوج کے اصلی یونانی سپاہیوں کو کچل دیا۔ سکندر اعظم کی اولاد کے ناقابل تسخیر سپاہیوں پر فتح نے مصریوں کے عزم و ہمت کو بہت جلا بخشی۔ مصریوں کی اس فتح کے بعد ان تمام بدقسمت مشرقی ممالک میں بغاوت کا لاوا پھوٹ بہا جن پر یونانی یا رومی سامراج حکمرانی کرتا تھا۔

اہل شام نے بھی بغاوت کی جن کو اغوا کر لیا گیا اور انہیں سمندر پار سسلی میں یونانیوں کے کھیتوں پر پابہ زنجیر غلاموں کی حیثیت سے کام کرنا پڑتا تھا۔ ان شامی غلاموں نے اپنے یونانی آقاؤں اور ان کے رومی محافظوں کے خلاف سسلی میں دو غضب ناک بغاوتیں کیں۔ تاریخ کے ابتدائی ابواب میں دنیا کے اہل یونان و روم کے ساتھ تصادم میں غلاموں کی بغاوت اور یونانی و رومیوں کے جبر و تشدد کی وحشت ناک داستان دنیا کے مغرب کے ساتھ تصادم کی متوازی تاریخ کے ملتے جلتے ابواب میں صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ آج بغاوت کی یہ تحریکیں ہندچینی ملایا میں زوروں پر ہیں اور افریقہ میں تین مقامات پر ان کے پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ اس مرحلے تک ہم تہذیبوں کے تصادم کی داستان کا مطالعہ یونان و روم کے واقعات سے صرف نظر کر کے محض اپنے حوالے سے کر سکتے تھے۔ تاہم اب ہم اس مرحلے پر پہنچ چکے ہیں کہ جہاں ہمارے کھاتے کی کتاب کے کھلے ہوئے صفحے پر متحرک انگشت ہمارے ابھی تک جاری حساب میں آخری اندراج کر رہی ہے۔ اس مرحلے سے

آگے کہ جہاں ہمارا مستقبل پس پردہ ہے۔ یونانی و رومی داستان ہمارے لیے فی الواقع رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ اوپر بیان کردہ ذریعہ معلومات سے میرا مطلب یہ تجویز کرنا نہیں کہ ہم تہذیبی تصادم کے اس مرحلے سے آگے کہ جہاں ہمارے اپنے واقعات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ دیکھیں کہ یونان و روم کی تاریخ میں کیا ہوا اور میکانکی طور پر یونانی و رومی واقعات کو جدید مغربی اصطلاحات میں ڈھال کر اپنے مستقبل کے بارے میں زائچہ کشی کریں۔ تاریخ اپنے آپ کو خود بخود نہیں دہراتی۔ یونانی و رومی دارلاستخارہ ہمارے لیے جو کچھ کرسکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہمارے ڈرامے کے مستقبل میں کئی متبادل ممکن الوقوع انجاموں میں سے کسی ایک کو ہمارے سامنے ظاہر کردے۔ ہمارے معاملے میں امکانات اس پلاٹ کے خلاف ہیں جو یونانی و رومی انجام کے سلسلے میں کام کررہے تھے۔ یہ بات ناقابل فہم نہیں کہ ہم اہل مغرب اور ہمارے غیر مغرب ہم عصر ہمارے ساتھ تصادم کے معاملے کو ایک ایسا موڑ دے سکتے ہیں جس کی مثال یونانی و رومی تاریخ میں نہ ملتی ہو۔ مستقبل میں جھانکتے ہوئے ہم اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اور ہمیں یہ سوچنے کے خلاف چوکس رہنا چاہیے کہ ہم خفیہ سڑک کا نقشہ کچھ آگے اور آگے تک ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس سب کے باوجود یہ ہماری حماقت ہوگی کہ اگر ہم اس روشنی کی ٹمٹماہٹ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے جھلملاتی ہے۔ یونان و روم کی قدیم تاریخ کے آئینہ سے جو روشنی ہمارے مستقبل پر منعکس ہوتی ہے وہ ہر قیمت پر سب سے زیادہ منور کرنے والی چمک ہے جسے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ ان احتیاطی تدابیر کو ذہنوں میں رکھ کر آیئے اب یونان و روما کی تاریخ کے صفحات الٹتے جائیں یہاں تک کہ ہم دنیائے یونان و روم کی اس تصویر تک پہنچ جائیں۔

جب ہم اس تصویر کا اس دنیا کی دو سو سال پہلے کی تصویر سے موازنہ کریں تو ہمیں ایک ہی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ اس وقفہ کے دوران وہاں کچھ بہتر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تاہم بدقسمتی سے ابھی تک ہماری مغربی تاریخ میں ویسی تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں۔

آخری صدی قبل مسیح میں دنیائے یونان اور روما انقلاب اور جنگوں کی افواہوں سے تباہ و برباد ہوگئی اور اسی اضطراب و تشدد کی آگ میں جل رہی تھی جیسے آج ہماری مغربی دنیا اضطراب کا شکار ہے۔ لیکن دوسری صدی عیسوی کے وسط میں ہم دیکھتے ہیں کہ وادی گنگا Ganges سے لے کر ٹائنی Theyne تک ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اس سارے وسیع و عریض علاقے میں جو ہندوستان سے لے کر انگلستان تک پھیلا ہوا ہے۔ یونانی و رومی تہذیب کو ہتھیاروں کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ اب یہ علاقہ تین ریاستوں میں بٹ چکا ہے اور یہ تینوں ریاستیں باہم مل جل کر کسی اختلاف کے بغیر زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ بحیرۂ روم کے ساحلوں کے اردگرد پھیلی ہوئی رومی سلطنت' عراق اور ایران کی پارتھی قلمرو اور وسطی ایشیا کی کشن سلطنت اور افغانستان اور ہندوستان کی سلطنت اپنے اندر پھیلی ہوئی تمام یونانی دنیا کو سمیٹتی ہیں۔ اگرچہ ان تینوں حکومتوں کے بنانے اور چلانے والے اصلاً غیر یونانی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ''یونان دوست'' کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ یونانی تہذیب کو اور خود حکمران قسم کی بلدیاتی کمیٹیوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کمیٹیوں کی وساطت سے یونانی طرز زندگی کو ابھی تک زندہ رکھا جا رہا ہے۔ آیئے ان کروڑوں اہل یونان و روم اور ان سے بھی کئی گنا بڑھ کر یونان پرست اور نیم یونان پرست سابق اہل مشرق اور سابق وحشیوں کے دلوں اور دماغوں میں جھانک کر دیکھیں جو کہ دوسری صدی کی رومی پارتھی اور کشن سلطنت کے امن کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس نسل کے آباؤ اجداد کی روحوں میں جنگ اور انقلاب کی لہریں موجزن تھیں۔ تاہم اب یہ لہریں اتار کی طرف مائل ہیں اور مشکلات کے اس دور کا ہوا ایک زندہ یاد کی حیثیت سے مدتوں سے ان کے ذہن سے اتر چکا ہے۔ تعمیری تدبر نے معاشرتی زندگی کا توازن قائم کیا۔ اگرچہ یہ توازن معاشرتی عدل کی مثالیت سے کوسوں دور تھا۔ تاہم یہ کسانوں اور پرولتاریوں کے لیے بھی اتنا برا نہ تھا جب کہ یہ توازن باقی تمام طبقوں کے لیے اسماعیلی نراجیت کے مقابلے میں یقیناً بہت بہتر تھا۔ اس معاشرتی توازن

نے زائد المیعاد اسماعیلی نراجیت کا خاتمہ کیا۔

زندگی اب پہلے کے مقابلے میں بہت محفوظ ہے لیکن اسی وجہ سے زندگی بڑی جامد بھی ہوگئی ہے۔ لیکن سیرز آرسیس اور کنشکا کی طرح انسانوں کو سن کرنے والے عاملین نے اس بھولے بسرے ماضی میں معاشی و سیاسی مسائل کی آگ میں جلنے اور دکھوں اور مصائب کا سامنا کرنے والوں کو اس اذیت سے نجات دی ہے۔ تاہم اس مستعد حکومت کے فلاحی کارناموں نے غیر ارادی طور پر انسانی روحوں میں روحانی خلا پیدا کر دیے تھے۔

یہ روحانی خلا کیسے پر کیے جاسکتے ہیں۔ یونانی و رومی دنیا میں دوسری صدی عیسوی کا سب سے بڑا روحانی خلا ہے۔ تاہم برخود غلط قسم کے سول حکام' شہری خدمت گار اور فلسفی ابھی تک اس امر سے بے خبر ہیں کہ ایسا کوئی سوال ایجنڈے میں شامل ہے۔ جن لوگوں نے وقت کی پیشانی پر ابھرے ہوئے نشانات کو پڑھ لیا تھا اور ان علامات کی روشنی میں کوئی قدم اٹھایا تھا وہ چھ گمنام اور الجھے ہوئے مشرقی مذاہب کے مبلغ تھے۔ دنیا اور اہل یونان و اہل روما کا تصادم جب طول العمری کے اس نکتے پر پہنچا تو ان عجیب و غریب مذاہب کے واعظین نے آغاز کا اعزاز بڑی خوبصورتی سے اہل یونانی و اہل روما کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ ان چوروں نے چوری کا عمل اتنی خوبصورتی سے انجام دیا کہ لٹنے والوں کے کھردرے ہاتھوں کو ابھی تک اس چوری کا احساس نہیں ہوا تاہم دنیا کے ساتھ طاقت کے مقابلے میں فتح یونان و روما کی ہوئی ہے۔

یونان و روما کی جارحیت اپنا زور صرف کر چکی ہے اور اب ایک جوابی حملہ کی تیاری ہو رہی ہیں۔ تاہم اس جوابی تحریک کا ابھی تک احساس نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ تحریک ایک بالکل ہی مختلف منصوبے کے تحت شروع کی گئی ہے۔ حملہ فوجی و سیاسی اور معاشی نوعیت کا تھا لیکن جوابی حملہ مذہبی بنیادوں پر کیا گیا تھا اس نئی مذہبی تحریک کا ایک عظیم الشان مستقبل ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں جن پر ہم انگلی رکھ سکتے ہیں۔ پہلی وجہ جس نے نئے مذاہب کے ابھرنے اور پھیلنے کی راہ ہموار کر دی وہ دوسری صدی عیسوی میں تہذیبوں کے تصادم

سے اظہار بیزاری تھا۔ ہم یہ مشاہدہ کر چکے ہیں کہ یونان کی تابکار تہذیب کے چیلنج کا جواب اہل مشرق نے دو متضاد طریقوں سے دیا جہاں عظیم ہیروڈ کے مکتب فکر کے سیاست دان بھی تھے جن کی تجویز یہ تھی کہ یونان و روما کے کلچر کی آب و ہوا میں رہتے ہوئے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں راس آ جائے۔ اس کے برعکس متشدد مومنین تھے کہ جن کی تجویز یہ تھی کہ آب و ہوا کی تبدیلی کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس طرح زندگی گزاری جائے کہ جیسے یہ تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ مذہبی تشدد پسندی نے تباہی و بربادی کا راستہ اختیار کر کے اپنے ساکھ کھودی جب کہ ہیروڈ کی پالیسی نے عدم اطمینان کا راستہ اختیار کر کے اپنے اہمیت ختم کر دی۔

اگر ان دونوں پالیسیوں میں سے کوئی سی بھی اختیار کی جاتی تو خدا جانے یہ تہذیبی جنگ کہاں پر اختتام پذیر ہوتی۔ اس زوال سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ کوئی بھی انسانی کلچر اپنے بلند بانگ دعویٰ کے باوجود انسانی ارتقاء کے لیے کوئی عظیم خدمات انجام نہیں دے سکتا۔ فریب خوردہ اذہان اور بجھے ہوئے دل اب عیسائیت اپنانے کے لیے تیار ہیں جو کہ انہیں تہذیبوں کے خشک دعوؤں اور جوابی دعوؤں سے بلند کر دے گا۔ ایک نئے معاشرے کے لیے یہ ایک سنہری موقعہ ہے کہ جس میں نہ کوئی مسیحی ہوگا اور نہ یہودی اور نہ یونانی۔ جس میں معاشرے میں آزاد اور غلام میں، مرد اور عورت میں کوئی فرق نہ ہوگا اور جس معاشرے میں سب ایک یسوع مسیح یا کسی Is, Is, Cupele, Mithyas یا کسی Bodhisattuas میں سے کسی ایک یا کسی Anitabla یا شاید Avalokita کے نام لیوا ہوں گے۔ تہذیبوں کے تصادم پر انسانی بھائی چارے کی نظیر غلبہ پا لے گی اور نئے مذاہب کی کامیابی کا پہلا راز یہی ہے۔ دوسرا راز یہ ہے کہ نئے معاشرے کہ جن کے دروازے بلا تمیز تہذیب، فرقہ، جنس سب کے لیے کھلے ہیں۔ یہ معاشرہ اپنے انسانی ارکان کو محدود معنوں میں مافوق البشر کا ہجولی بنا دیتا ہے۔ اس معاشرے کی یہ خوبیاں اس سبق کا نتیجہ ہیں جو کہ اس نسل کے دلوں پر کہ جس نے دکھوں کے ایک زبردست دور کو اور اس کے بعد مسیحی امن کی طرز کو بھی

دیکھا ہے۔ یہ سبق جو اس نسل کے دلوں پر بڑے گہرے انداز میں نقش ہوا ہے وہ یہ ہے کہ فطرت انسانی رحمت خداوندی کے بغیر نامکمل ہے۔ کم از کم مجازی خداؤں کی دو نسلوں کی آزمائش کی گئی اور ان کی شدید ضرورت محسوس کی گئی۔ خدائی کے درجے کو پہنچے ہوئے فوجی ایک سنگین سیکنڈل ثابت ہوئے۔ سینٹ آگسٹائن نے جو داستان بیان کی ہے اس کے مطابق Imrrhenian Pirate نے سکندر اعظم کے منہ پر اسے کہا کہ جو کچھ اس نے ایک یورپی فوج کے ساتھ کیا ہے اگر وہی کچھ وہ اپنے دو ساتھی مجرموں کے ساتھ کرتا تو اسے خدا کہنے کے بجائے گروہ مجرمین کا رکن کہا جاتا۔ اور دیوتا پولیس مینوں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ آگسٹس اپنے ساتھی مجرموں سے چھٹکارا پا کر پولیس مین بن گیا ہم اس کے لیے اس کے شکر گزار ہیں۔ اور جب ہمیں اپنی احسان مندی کی اس اصلاح یافتہ مجرم ''خدا'' کی عبادت کر کے تصدیق کرنے کی ضرورت پڑی تو ہم اپنی خواہش کی تکمیل کلی تعین اور جوش و ولولے سے نہ کر سکے اور ابھی تک ہمارے دل بھوکے اور ہماری روحیں پیاسی ہیں۔ ایک ایسی خدائی کے لیے پیاسی ہیں کہ جس کی پرستش ہم روح کی گہرائیوں سے کر سکیں۔

ہم آخر کار ان الوہی ہستیوں کی موجودگی میں کہ جن کے لیے ہم نے اپنی زندگیوں اور اپنے دل و دماغ کی قوتوں کو وقف کر سکتے ہیں۔ متھر اس قائد کی حیثیت سے ہماری رہنمائی کرے گا۔ آئسس ماں کی حیثیت سے ہماری پرورش کرے گا۔ مسیح علیہ السلام نے خود کو الوہی قوت اور شرف سے تہی دامن کر لیا۔ اور ہماری خاطر صلیب پر چڑھے اور ہماری خاطر گوتم بدھ کی طرح نروان کی دہلیز پر پہنچ کر دائمی مسرت کی وادی میں داخل ہونے کے لیے آخری قدم اٹھانے سے مجتنب رہے۔

راہ حق کے اس عظیم متلاشی نے خوب سوچ سمجھ کر جگ جگ زندہ رہنے کے غمناک چکر کی مذمت کی۔ انہوں نے یہ عظیم قربانی اپنے دوسرے ذی حس انسانوں کے لیے دی۔ وہ ان ساتھی انسانوں کی راہ نجات کی طرف صرف اس وقت تک رہنمائی کر سکتے تھے جب

تک وہ خود دکھ اٹھانے کی عظیم قیمت ادا نہ کریں۔

یہ تھے نئے مذاہب کے ثمرات انسانیت کی اکثریت کے لیے جو شاہی امن کے دوران تھک چکے تھے۔ اور بوجھ تلے دب چکے تھے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ غالب اقلیت کی کیا حالت ہے جس نے دنیا کو فتح کر کے اور لوٹ مار اور غارت گری کر کے تباہ و برباد کیا۔ اور اب وہ ان کھنڈرات پر خود کمشن یافتہ پولیس مینوں کی طرح گشت کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے لہلہاتی ہوئی زندگی کو صحرا میں بدل دیا اور اسے امن کہا۔ یہ ہے وہ فتویٰ جو ان کے ادیبوں میں سے ایک نے ان کے ہاتھوں ظلم و تعدی کا نشانہ بننے والے مظلوموں میں سے ایک کی زبان سے کہلوایا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یونانی اور رومی برخود غلط دنیا کے آقا جارحیت کے خلاف مذہبی خطوط پر اٹھنے والے چیلنج کا کیسے جواب دیں۔ یہ مذہبی لائحہ عمل حکمرانوں کی جنگی اور سیاسی منصوبہ بندی کے تحت جارحیت کا جواب تھا۔

اگر ہم مارکسٹر کی نسل کے اہل یونان و روما کے دلوں میں جھانک کر دیکھیں تو ہم یہاں بھی ایک روحانی خلا محسوس کریں گے۔ کیونکہ دنیا کے ابتدائی فاتحین نے بھی ہم اہل مغرب کی طرح ایک طویل عرصے سے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ رکھا تھا۔ جو طرز زندگی انہوں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا اور تمام اہل مشرق اور بربروں کو جس یونانی کلچر کے زیر اثر لانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ یہ ایک لادینی طریقہ تھا جس میں عقل کو اس طرح مجبور کر دیا گیا کہ وہ ایسے فلسفے تراشے جو مذہب کی جگہ لے سکیں۔ ان فلسفوں نے عقل کو لامحدود آزادی بخشی اور روح کو قانون فطرت کے اندوہناک چکر کی گرفت میں جکڑ دیا۔ ''اوپر اور نیچے'' ''آگے اور پیچھے'' چکر ہی چکر۔ یہ ہے وہ جہاں کی یکساں بجنے والی بے معنی موسیقی۔ یہ ہے زندگی کے بارے میں وہ تاثر جسے فلسفیوں کے شہنشاہ مارقس نے تسلیم کیا ہے۔ ایک متوسط درجے کی ذہانت کا مالک شخص جو چالیس سال کی عمر کو پہنچ گیا ہو وہ ہر اس چیز کا تجربہ کرے گا جو گزر چکی ہے گزر رہی ہے اور ابھی آنے والی ہے۔ یہ یونان اور روم کی حکمراں فریب خوردہ اقلیت۔ حقیقت میں اس روحانی فاقہ زدگی کے عالم سے گزر رہی ہے کہ جس

سے ہم عصر دنیا کی اکثریت گزر رہی تھی۔ لیکن وہ تمام نئے مذاہب جو تمام مردوں اور عورتوں کو بلاتمیز پیش کیے جا رہے تھے اگر تبلیغی اداروں نے مذہب کی عجیب وغریب کڑوی گولی پر شکر نہ چڑھا رکھی ہوتی تو وہ فلاسفروں کے گلے میں اٹک جاتی اور اسی لیے نئے مذاہب کو یونانی تعلیم یافتہ سخت جان اور اکھڑ عوام کو خدا کی طرف پھیرنے کے آخری اور مشکل کام کی انجام دہی کے لیے اپنے آپ کو مختلف لباس زیب تن کرنے پڑے۔ اس میں بدھ مت سے لے کر عیسائیت تک سبھی مذاہب نے ظاہری طور پر اپنے آپ کو یونانی طرز میں پیش کیا اور عیسائیت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خود کو یونانی فلسفیانہ اصلاحات میں پیش کیا۔

یہ تھا دنیا اور اہل یونان واہل روما کے مابین تصادم کا آخری باب۔ یونان وروم نے دنیا کو ہتھیاروں کی طاقت سے فتح کرنے کے بعد دنیا نے اپنے فاتحین کو نئے مذاہب کی طرف موڑ کر اپنا اسیر بنالیا۔ اور جنہوں نے حاکم ومحکوم اور یونانی اہل مشرق اور بربروں کے درمیان کسی تفریق کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر انہیں نئے مذاہب کی طرف بلایا۔ کیا اس یونانی داستان کے تاریخی انجام کی طرح کوئی شے ہماری دنیا کے ساتھ غیر اختتام پذیر تاریخ میں لکھی جانے والی ہے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم مستقبل کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ ہم صرف یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک چیز جو پہلے واقع ہو چکی ہے وہ تاریخ کے ایک دوسرے قصے میں کم از کم آگے آنے والے مختلف امکانات میں سے ایک ہے۔
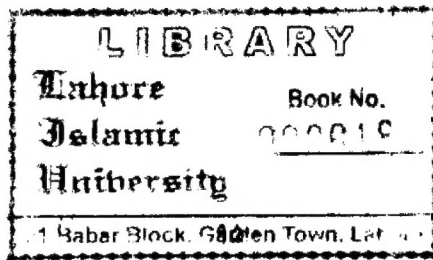
آئینہ تاریخ میں جہاں عام دلچسپی کے وقائع دکھائی دیتے ہیں وہاں انسانی زندگی کی سماجی، معاشرتی، تمدنی، ثقافتی اور علمی اقدار و روایات کی تفصیلات بھی جلوہ گر ہیں۔ اقوام اور قبائل کی باہمی کشمکش اور آویزش، سلطنتوں کی باہمی رقابت اور مخاصمت مفادات اواستحصال کی جنگ گزشتہ وقائع کی یادداشتیں، اقوام ماضیہ کے تذکرے، روئے ارضی کی دل فریبیاں اور دلچسپیاں دربار شاہی کے وقائع نگاروں کی روداد یں، ماہرین فن کے عجائب اور کارنامے، آثار قدیمہ کی تفصیلات، عظیم شخصیات کی سوانح، رزم و بزم کی حکایات، فکر و دانش کی جھلکیاں اور محلات و قصور، شاہی درباروں اور سلطنتوں کے دارالخلافوں میں جنم لینے والی سازشیں، فتنے اور فسانے نیز مختلف اداروں، تنظیموں اور تحریکات کا آغاز وارتقا سبھی تاریخ کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

تہذیبوں کی کشمکش اور تاریخ کے پیکار کو مغرب میں جن بڑے مؤرخین نے اپنا موضوع بنایا اور اس پر سنجیدگی کے ساتھ اپنا قلم اٹھایا ہے ان میں سے ایک پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی (Arnold Joseph Toynbee) ہے۔

ٹائن بی عہدِ حاضر کے ممتاز مؤرخین میں سے ایک ہیں۔ **''دنیا اور مغرب''** کے ان لیکچرز میں ہم عصر تہذیبوں کے تصادمات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

ISBN 969-8983-08-2